البضاعة المزجاة لمن يطالع المرقاة شرح المشکاة (مترجم)

تالیف :

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی مدظلہم

نگران شعبۂ تخصص فی الحدیث

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مترجم :

مولانا راؤ محمد ندیم مدظلہ

فاضل دارالعلوم کراچی

نوٹ :

مولانا چشتی صاحب کے اس مقدمے کا ترجمہ افادیت کی غرض سے مرقاۃ المفاتیح مترجم سے الگ کر کے شئیر کیا جا رہا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاّ علی قاری

آپ کا نامِ نامی علی، اور آپ کے والد گرامی کا نام سلطان محمد(۱) ہے۔ ابو اسحاق ابراہیم بن عبد اللہ ساقزی رومی نے ملا علی قاری کی کتاب "فيض الأرحم وفتح الأكرم في شرح الحزب الأعظم والورد الأفخم" کے مقدمہ میں (ان کا نام یوں) ذکر کیا ہے: علی بن سلطان محمد القاری۔ (حرم کے) مجاورین میں سے تھے۔ اپنے شہر ہرات سے ہجرت کر گئے تھے۔ عجمیوں کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا جڑواں نام رکھتے ہیں۔ جیسے فاضل محمد اور صادق محمد (وغیرہ)۔ آپ کے والد کا نام سلطان محمد بھی اسی قبیل سے ہے جیسا کہ سنا

۱: مؤرخ عبد الملک عصامی شافعی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "سمط النجوم العوالي والتوالي (۴: ۳۹۴)" میں ملا علی قاری کے والد کا نام ذکر کرتے ہوئے فقط لفظ "سلطان" پر اکتفا کیا ہے۔ اور ایسے ہی حافظ محب الدین ابو الفیض محمد مرتضی بلگرامی زبیدی حنفی (ت ۱۲۰۵ھ) نے اپنی کتاب "تاج العروس من جواهر القاموس" (۱: ۳) کے مقدمے میں، اور شیخ محمد عبد الحئ لکھنوی نے اپنی کتاب "طرب الأماثل بتراجم الأفاضل (ص ۲۲۵)" میں بھی اسی لفظ پر اکتفا کیا ہے، جس کی بنیاد نام رکھنے میں عربوں کی اس عادت کی اتباع ہے کہ وہ مفرد نام رکھا کرتے ہیں۔ لیکن جس نے سلطان محمد کے درمیان لفظ ابن بڑھا کر سلطان بن محمد ذکر کیا ہے، اس نے صحیح نہیں کہا۔

صحیح نام وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ سندھ میں ٹنڈو سائیں داد کے علاقے میں ہم نے عالم کبیر شیخ محمد ہاشم جان مجددی کے پاس موجود مصحف پر ملا علی قاری کے اپنے قلم سے لکھا ہوا نام ہم نے خود دیکھا ہے۔ ایسے ہی آستانہ، ہند اور مصر میں ان کی مطبوعہ تمام کتب پر بھی یہی نام ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔

گیا۔اور باقی رہی بات ان کے بادشاہ ہونے کی، تو ایسی کوئی بات کبھی نہیں سنی گئی۔(۲)

اس کتاب کی شرح کی تالیف مالک اور وہاب کی مدد سے رجب کے مہینے کی چھٹے تاریخ ۱۱۳۴ھ، کو مکمل ہوئی۔ جب کہ اس کی کتابت کی ابتدا چھٹے رمضان ۱۱۳۳ھ کو ہوئی تھی۔ اول وآخر اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اس پر کہ اسی نے اس کتاب کو مکمل کرنے کی توفیق دی۔ اور اللہ کی مخلوق میں ظاہراً و باطناً سب سے زیادہ شرافت ونجابت والی ہستی پر صلاۃ وسلام ہو۔

تمام تعریفیں اس اللہ ہی کے لیے ہیں جس نے اس بات کی توفیق دی کہ اس شرح کی کتابت کی تکمیل اس فقیر حقیر پر تقصیر محمد حافظ کے ہاتھوں ہو، جو مولداً اعشاقی، اور مذہباً حنفی ہے۔ کتابت کا اختتام بروز سوموار قسطنطنیہ میں ۱۱۷۰ھ، ماہ ربیع الآخر میں ہوا۔ اے اللہ درود و سلام ہمارے سردار حضرت محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر بھیج۔ آمین۔

اس شرح کا ایک نسخہ سندھ میں پیر جھنڈو بستی میں صاحب علم کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اور ہم نے اسی سے یہ عبارت نقل کی ہے۔

اور ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ کی کنیت: ''ابوالحسن'' ہے جیسا کہ حافظ سید عبدالحئی کتانی فاسی (ت ۱۳۸۱ھ) نے اپنی مشہور کتاب ''التَّراتِيبُ الإدارية والعمالات والصِّناعات والمَتاجر والحَالَةِ العلمِيَّة التي كانت علىٰ عَهدِ تَأسِيسِ المَدينة المُنَوَّرَة'' میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

اور مسند ابو حنیفہ کی روایت حصکفی کی ایک شرح ابوالحسن علی قاری کے قلم سے ہے، جو ابن سلطان مکی کے نام سے معروف ہیں۔

(التَّراتيب الإداريه (ج۱، ص ۱۷) الرباط ۱۳۴۶ھ)

اور ملا علی قاری کا لقب نورالدین ہے۔

ملا علی قاری کی پیدائش ہرات میں ہوئی (۴) (مجھے ابھی تک ان کا سنِ پیدائش نہیں مل سکا)، اور وہیں پلے بڑھے۔ وہیں جامع ہرات میں ابن خطیب شیخ عالم قاری معین الدین بن حافظ زین الدین ہروی سے قرآن مجید حفظ کیا اور علم تجوید حاصل کیا۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے رسالہ: ''شَمُّ العَوَارِض فِي ذَمِّ الرَّوَافِض'' میں خود تصریح کی ہے۔ چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے:

علم قراءت میں میرے مرحوم استاد مولانا معین الدین بن حافظ زین الدین رمان گاہ (۵) (گازرگاہ) کے رہنے والے تھے۔

۲: اس کے مؤلف نے آخر میں کہا ہے:

۴: یہ خراسان کے شہروں میں سے ایک بہت بڑا اور مشہور شہر ہے، جہاں بہت سے مؤرخ، لغوی، فقہاء اور نحوی علماء پیدا ہوئے ہیں۔ (دیکھیے: معجم البلدان، لياقوت حموي)۔

۵: دیکھیے: شَمُّ العوارض في ذَمِّ الرَّوافِض. اس کتاب کا جدید خط نسخ میں لکھا ہوا ایک واضح مخطوطہ ملا علی قاری کے ایک جلد میں اکٹھے کیے گئے ترپن رسائل کے مجموعہ میں شامل ہے۔ اور یہ مجموعہ کلیہ شرقیہ پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مجھے اس کی اطلاع شیخ بحاثہ عبدالقدوس قاسمی نے دی تھی۔

"البضاعة المزجاة" کی تکمیل کے بعد میں نے مغربی پاکستان کا ایک علمی سفر کیا تھا۔ جب میں پشاور پہنچا، اور کلیہ شرقیہ پشاور کے کتب خانہ کو دیکھا، اور شیخ عالم بحاثہ عبد القدوس قاسمی کی زیارت کی، جو کہ کلیہ شرقیہ میں استاد تھے تو دورانِ گفتگو "البضاعة المزجاة" کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی۔ شیخ قاسمی نے کہا کہ: کلیہ شرقیہ کے مکتبہ میں ایک مجموعہ کتب ایسا ہے جس میں ملا علی قاری کے ترپن رسائل ہیں، کیا تم نے ان کا مطالعہ کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، تو انہوں نے بتایا کہ: ان رسائل میں ملا علی قاری نے اپنے بعض اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، اور وہ نسخہ اس وقت میرے پاس موجود ہے۔ ان کی اس بات سے میرا اشتیاق اور بڑھا۔ اور شیخ نے مجھے اس سے استفادہ کا موقع دیا۔ ان کی اس عنایت پر میں ان کا نہایت شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں میری طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

آپ نے درسی کتب اور متعارف علوم ہرات ہی میں اپنے زمانے کے ماہر شیوخ سے حاصل کیے۔ اور جب پہلے صفوی رافضی بادشاہ سلطان اسماعیل بن حیدر صفوی موسوی نے ہرات پر تسلط قائم کر لیا، اور ان پر ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں قتل، اور ان کے مالوں کو لوٹا، اور ہرات میں روافض کے شعائر کو پھیلانا شروع کیا، اور اپنی وسعت کے باوجود وہاں کی زمین مسلمانوں کے لیے تنگ ہو گئی تو مسلمان وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اور ملا علی قاری نے بھی وہاں سے حرم اللہ کی طرف ہجرت کی۔ اور وہیں مکہ مکرمہ میں قیام کیا، اور اسے ہی وطن بنا لیا۔ اور اس (حرمِ مکہ میں) اقامت پذیر ہونے (کی نعمت) پر اللہ کی تعریف کرتے ہوئے اپنے رسالہ: "شَمُّ العوارض" میں یوں رقم طراز ہیں:

احادیث میں وارد ہوا ہے کہ: شیطان کو گالیاں نہ دو، اور اس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہو۔

اس میں اس تفرقہ سے، جسے دوئی کا مقام کہا جاتا ہے، توحیدِ محض اور جمعیت کے مقام کی طرف ترقی کرنے پر تنبیہ ہے۔ اور اللہ نے مجھے بدعت کے مرکز سے سنت کے مرکز کی طرف ہجرت کرنے کی جو قدرت اور توفیق بخشی ہے اس پر اللہ ہی کی حمد وتعریف بیان کرتا ہوں۔ یہ ایسا علاقہ ہے جو مہبطِ وحی ہے، اور یہیں نبوت کا ظہور ہوا اور اس نے مجھے یہاں قیام کی مستقل توفیق بخشی، من غیر حولٍ منّی ولا قُوّۃ (۶)"۔ اس میں نہ تو میرا کوئی کمال ہے، اور نہ ہی میری کوئی خوبی۔

آپ نے قرآن مجید مکہ مکرمہ کے اجل قراء کرام سے پڑھا، اور انتہائی پختہ حفظ کیا۔ علاوہ ازیں شاطبیہ کو بھی زبانی یاد کیا، ساتوں قراءتوں کو شاطبیہ کے طریق سے پڑھا اور اس کی قراءات میں انتہائی اتقان حاصل کیا۔ قرآن مجید کو حسنِ ترتیل سے اس قدر پڑھا کہ "قاری" کے لقب سے ہی شہرت پائی۔ ملا علی قاری نے علم قراءات میں اپنی سند کو ایک تو اپنی کتاب: "المِنَحُ الفِكرِيَّة على متن الجزرِيَّة"، کے آخر میں نقل کیا ہے، اور دوسرے اپنی "شاطبیہ" کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

جہاں تک قراءات کی تحقیق اور روایات کی چھان بین میں میری سند کا تعلق ہے، تو وہ مشائخ عظام اور قراء کرام تک پہنچتی ہیں۔ اور میرے ایسے قراء اساتذہ میں سب سے بڑے استاد، اس فن میں کامل، مکہ مکرمہ میں شیخ القراء، یگانۂ روزگار، عالم بے بدل، نیکوکار عامل، یکتا وکامل شیخ سراج الدین عمر یمنی شوائی ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں بلند مراتب تک پہنچائے، اور میری اور پوری امت کی طرف سے

۶: دیکھئے: "شَمُّ العَوارِض" (ص ۳۰۰)، ضمن مجموعه رسائل مخطوطه در مكتبه كليه شرقيه، پشاور۔

پوری پوری جزاء خیر دے۔

انہوں نے علم قراءت ایک ایسی جماعت سے حاصل کیا، جنہوں نے مدینہ منورہ کے خطیب وامام علامہ محمد بن یقطان کے سامنے علم قراءت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اور انہوں نے مصر کے رہنے والے شیخ زین الدین عبدالغنی ہیثمی سے علم قراءت کو حاصل کیا، اور انہوں نے علم قراءت خاتمة القُرّاءِ والمُحَدِّثين شیخ شمس الدین محمد بن محمد بن محمد جزری قُدِّسَ سِرُّهُ السِّرِّيُّ سے حاصل کیا۔(۷)

ملا علی قاری تحصیل حدیث میں مشغول ہوئے تو مکہ کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، اور انہیں میں مکہ کے مفسر، اور اپنے زمانے کے فقیہ، شیخ زین الدین عطیہ بن علی بن حسن سلمی مکی بھی ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۸۳ھ میں ہوئی۔ ملا علی قاری اپنی کتاب "مرقاةُ المفاتیح" کے مقدمہ میں کہتے ہیں:

میں نے یہ عظیم کتاب (مشكاة المصابيح) حرم محترم کے شیوخ سے پڑھی۔ اللہ ہمیں ان سے، اور ان کی علوم کی برکات سے متمتع فرمائے۔ انہی اساتذہ میں یکتائے زمانہ، نابغہ روزگار مولانا علامہ شیخ عطیہ سلمی بھی ہیں، جو کہ شیخ الاسلام اور راہنمائے خلق مولانا شیخ ابوالحسن بکری (۸) کے شاگرد ہیں۔

---

۷ : دیکھئے: "المنح الفکریہ" (ص ۷۳، ۷۴، طبع مصر ۱۳۶۷ھ)۔ مزید دیکھئے: "شرح الشاطبيه" (طبع مجتبائی، دهلی، هند ۱۳٤۸ھ)۔

۸ : علی پاشا مبارک (ت ۱۸۹۳ھ) نے اپنی کتاب: "الخطط الجديدة لمصر" (۳ : ۱۳۷، القاهرة) میں بکری کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

سید محمد ابوالحسن (بن جلال الدین محمد ابی البقاء بن عبدالرحمن بن احمد) بکری صدیقی شافعی مفسر اور شیخ الاسلام زکریا کے تلامذہ میں سے تھے۔ تمام فنون کے عالم، اور تقوی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اپنی تفسیر کی تالیف سے ۹۲۶ھ میں جمادی الثانیہ کے آخر میں فراغت حاصل کی، اور اس وقت ان کی عمر اٹھائیس سال، ایک مہینہ اور اٹھارہ دن تھی۔ اس لیے کہ ان کی ولادت ۸۹۸ ھ میں ہوئی تھی۔ (یہ تفصیل ان کی تفسیر کے آخر میں مترجم کے والد صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر کا اختصار ہے، جو کہ انکے اپنے خط سے نقل کی گئی ہے اور یہ تحریر کتب خانہ مصریہ "خدیویہ" میں موجود ہے،.... ان کے سفید رُو بیٹے نے مغرب کے سلطان، جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا، کی جانب بھیجے جانے والے اپنے خط میں ذکر کیا ہے کہ انکے والد کی وفات ۹۵۲ ھ میں چون سال کی عمر میں ہوئی اور وہ ایک سال مصر میں قیام کیا کرتے تھے اور ایک سال مکہ مکرمہ میں۔

ان کے شاگرد شیخ حافظ نجم الدین محمد بن احمد غیطی مصری شافعی (ت ۹۸۱ھ، یا ۹۸۲ھ) اپنے "ثبت" میں رقم طراز ہیں:

ہمارے شیخ فرد فرید، نادرہ روزگار، عجوبہ زمان یکتا عالم ابوالحسن بکری صدیقی شافعی ہیں۔ اللہ تعالی ان کی برکات کو نافع بنائے، اور ان سے راضی ہو۔ میں نے ان سے تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کو حاصل کیا ہے۔ ان کی تفسیر وفقہ وغیرہ میں بہت سی تصنیفات ہیں۔ اور تصوف میں اوراد کے موضوع پر ان کے کئی رسائل ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۵۲ ھ میں ہوئی۔

اس ثبت کا ایک نسخہ صاحب علم وہب اللہ شاہ کے ہاں بستی پیر جھنڈو، سندھ میں محفوظ ہے۔

مزید دیکھئے: "مرقاة المفاتيح" (۲ : ۵۷۵، و ٤ : ٦٩٨، و ۷۰۲)۔

ملا علی قاری اپنی کتاب مرقاۃ میں ان سے (یعنی شیخ عطیہ سے) اور ان کی تفسیر سے جا بجا فوائد نقل کرتے ہوئے، کبھی تو انہیں ''ہمارے شیخ'' (۹)، ''ہمارے استاذ'' (۱۰) اور ''مولانا'' (۱۱) کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اور کبھی ''عُمدَةُ المُفَسِّرِین'' (۱۲) کا لقب دیتے ہیں۔ ایسے ہی اپنے رسالہ ''شمُّ العَوَارِض'' میں انہیں: علم تفسیر میں میرے استاد شیخ عطیہ مکی سلمی، کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

ملا علی قاری کے اساتذہ میں مسند مکہ، علامہ شیخ زکریا بھی ہیں۔ چنانچہ ملا علی قاری اپنی کتاب ''اَلمِرقَاة'' کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

اور میرے ان مشائخ میں سے، جن سے میں نے علم حدیث (قراءۃً) حاصل کیا ہے، نام ور فاضل، اور بہترین عالم مولانا سید زکریا (۱۳) بھی ہیں، جو کہ عالم ربانی مولانا اسماعیل (۱۴) شروانی کے شاگرد ہیں۔ اور وہ عارف باللہ، مرجع خاص و عام خواجہ عبید

۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲: دیکھئے: ''مرقاة المفاتيح'' (۱: ۴۶۲، و ۲: ۵۲، و ۳: ۱۱۶، و ۵: ۶۶۱، طبع مصر)، مزید دیکھیں: ''الكواكب السائرة للغزّي'' (۱: ۱۹۴-۱۹۸)، ''النُّورُ السَّافِر لِلعِيدَرُوسِي'' (ص ۴۲۷- ۴۲۹)، '' شَذَراتُ الذَّهَب لابن العماد الحنبلي'' (۸: ۲۹۲)، اور ہماری کتاب فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ (ص ۳۴۹ - ۳۵۲)۔

۱۳: ان کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی فارسی کتاب ''زاد المتقين في سلوك طريق اليقين'' میں فرماتے ہیں:

''سید زکریا انتہائی بزرگی اور شرافت والے تھے۔ ان سے برکت حاصل کی جاتی تھی۔ نادرۂ روزگار، کبیر السن، میٹھی طبیعت والے اور تکلف سے دور تھے۔ ان کا اصلی وطن تو ہند تھا، لیکن نشو و نما اور تربیت یمن کے علاقے میں ہوئی۔ اور جب مکہ مکرمہ پہنچے تو پھر اسی کو وطن بنا کر وہیں درس حدیث دینے اور افادہ کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اکثر عجمی حضرات ان سے علم اور برکت حاصل کرتے تھے۔ شیخ اپنی کبر سنی اور جسمانی کمزوری کے باوجود جبل ابی قبیس پر واقع اپنے گھر سے بیت اللہ الحرام آیا کرتے، اور نماز ادا کیا کرتے۔ شیخ اپنے ہاتھ کی کمائی سے ہی کھایا کرتے تھے، اور اپنے تمام ذاتی اعمال، اور اہل و عیال کی ذمہ داریوں کو بڑی سختی اور اصرار سے خود ہی نبھایا کرتے تھے۔ ان کی قبر جنت معلیٰ میں ہے، جس کی لوگ زیارت بھی کرتے ہیں، اور ان سے برکت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر اور تمام صالحین پر رحمت ہو''۔
(ورقہ ۱۲۳، فارسی کی تعریب اور تلخیص کے ساتھ)۔

۱۴: نجم الدین محمد بن محمد غزی (ت ۱۰۶۱ ھ) اپنی کتاب ''الكَوَاكِبُ السَّائِرَة، بأعيان أئمة العاشرة'' (۲: ۱۲۳، ۱۹۴۵ھ بیروت، لبنان) میں رقم طراز ہیں:

''شیخ امام علام محقق مدقق، صالح زاہد، عارف باللہ تعالیٰ مولیٰ اسماعیل بن عبداللہ شروانی حنفی، نام ِ نامی تھا۔ اپنے زمانے کے علماء سے علم حاصل کیا، جن میں علامہ جلال الدین تھے۔ پھر اپنے شیخ عارف باللہ تعالیٰ خواجہ عبیداللہ سمرقندی کی خدمت میں آ گئے اور ان کے ہاں تربیت کروائی، اور ان کے کامل تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔

جب خواجہ عبیداللہ کی وفات ہوئی تو مولیٰ اسماعیل مکہ مکرمہ کی جانب کوچ کر گئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ پھر سلطان ابی یزید خان کے دور حکومت میں روم میں داخل ہوئے۔ پھر مکہ کی طرف واپس ہوئے اور وفات تک وہیں مستقل قیام کیا۔ شیخ الاسلام نے مکہ مکرمہ کے جن مجاور اولیاء اللہ کی صحبت اٹھائی، اُن میں اِن کا شمار کیا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ کو اپنے والد صاحب سے نقل کرتے سنا کہ: وہ ان کی بہت تعریف ....

اللہ (۱۵) سمرقندی کے شاگردوں میں سے ہیں، جو کہ خواجہ بہاء الدین نقشبندی (۱۶) رحمہم اللہ کے متبعین میں سے ہیں۔ اللہ ان کی روحوں کو سرسبز وشاداب رکھے، اور ان کی برکات وفتوحات سے ہمیں بھی نوازے۔

.........کیا کرتے تھے، اس لیے کہ وہ دمشق سے آئے تھے اور نوریہ میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ فاضلین کی ایک جماعت آپ کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔ انہوں نے آپ سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔ اس کے بعد آپ جامع مسجد تکیہ سلیمیہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ چنانچہ ابن طولون نے کہا ہے:

میری ان سے وہاں ملاقات ہوئی ہے۔ اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے حدیث امیر جمال الدین خراسانی محدث سے حاصل کی۔ کہتے ہیں: میں نے ایک مرتبہ انہیں (یعنی امیر خراسانی کو) دیکھا کہ وہ مفسر قرآن امام بغوی کی تنقیص کر رہے تھے، جس کے سبب میرے جی میں ان سے نفرت آ گئی۔ اس لیے کہ امام بغوی تو ائمۂ سنت میں سے ہیں۔

میں کہتا ہوں: شاید ان کے اس بغض کا سبب یہ ہو کہ عجمی علماء کا اسلوب یہ ہے کہ وہ دقیق مباحث کی طرف مائل ہوتے ہیں، اور ان پر عقلی خامہ فرسائی بھی کرتے ہیں، جب کہ ماثورات کا اس قدر اہتمام نہیں کرتے۔ اور تفسیر بغوی کا غالب حصہ مذکورہ بالا مباحث سے خالی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تنفر کا سبب ہماری بیان کردہ وجہ ہو، نہ کہ وہ جس کا وہم ابن طولون کو ہوا ہے کہ وہ بدعات وغیرہ کی طرف مائل تھے۔ اور ان کی صفائی کے بارے میں شیخ الاسلام الجد کا قول تمہارے لیے کافی ہے''۔

صاحب شقائق نعمانیہ نے کہا ہے:

''وہ معمر، صاحب وقار، صاحب ہیبت، لوگوں سے الگ تھلگ، اپنے کام سے کام رکھنے والے، عادتاً مروّجہ تکلف سے دور اور لوگوں سے بہت اچھا معاملہ کرنے والے شخص تھے۔ لوگوں میں سے چھوٹا ہو یا بڑا، غنی ہو یا فقیر، ان کے ہاں برابر تھا۔ ظاہری علوم میں بھی انہیں فضل وکمال حاصل تھا۔ موصوف نے تفسیر بیضاوی پر ایک حاشیہ لکھا تھا، اور مکہ مکرمہ میں اس حاشیہ اور بخاری شریف کا درس دیا کرتے تھے۔ مکہ مکرمہ ہی میں دس ذوالحجہ ۹۴۲ھ کو وفات ہوئی''۔

ابن طولون نے کہا ہے:

''ان کی وفات دس ذوالقعدہ کو تقریباً اسی سال کی عمر میں ہوئی۔ اور ربیع الاول کے شروع میں، جمعہ کے دن، جامع دمشق میں ۹۴۳ھ کو ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی''۔ رحمہ اللہ۔

ان کے حالاتِ زندگی کے لیے دیکھئے: "طاش كبرىٰ زاده، الشّقائق النعمانيه في عُلَماء الدَّولَةِ العُثمَانيه"(١: ٣٩٧)، طبع علىٰ هامش "وفَيات الأعيَان" طبعة مصر، ١٣١٠ھ، و "مِرقاةُ المفاتيح"(٣ : ٤٤) طبع مصر، و "شذراتُ الذَّهب لابن العماد" (٨ : ٢٤٧).

۱۵ : ابوالخیر احمد معروف بہ طاش کبریٰ زادہ (ت ۹۶۸ھ) نے "الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيَة فِي عُلَمَاءِ الدَّولَةِ العُثمَانية" میں کہا ہے:

''شیخ، عارف باللہ، خواجہ عبید اللہ سمرقندی رحمہ اللہ تعالی تاشقند کے علاقے میں پیدا ہوئے، جو کہ شاش کی ولایت کا حصہ ہے۔ یہ بات ان کے بعض احفاد سے روایت کی گئی ہے۔ اور وہ خواجہ محمد قاسم بن خواجہ عبد الہادی بن خواجہ محمد عبد اللہ بن خواجہ عبید اللہ ہیں، جن کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالی عنہ سے جا ملتا ہے''۔

مزید کہتے ہیں: میرے دادا جان کے حوالے سے یہ بھی منقول ہے کہ:

''خواجہ عبید اللہ نے کہا: میں ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔ اور اس غفلت کا قصہ یہ ہے کہ: ان دنوں میں سولہ سال کا تھا، اور تاشقند میں اپنے معلم کے پاس جایا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں زمین نرم ہونے کے وجہ سے بعض جگہ کیچڑ اور پھسلن بہت زیادہ تھی، اور کہیں کہیں دلدل بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک جگہ بے دھیانی میں میرا پاؤں دلدل میں پھنس گیا، اور میں اسے کھینچ کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی میں میرا دھیان اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہٹ گیا، اور غفلت ہوگئی''۔

مزید کہتے ہیں: ''میرے دادا جان نے طریقِ تصوّف کو مولیٰ یعقوب چرخی سے حاصل کیا تھا، اور انہیں نے دادا جان کو ذکر کی ترتیب تلقین کی تھی''۔

مزید یہ بھی بتاتے ہیں کہ: ''میرے دادا جان سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے کہا: جب میں بیس سال کا تھا، اس وقت مجھ پر تحصیلِ علم کا داعیہ بہت غالب ہوا، چنانچہ میں تاشقند سے مولیٰ نظام الدین خامرس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ان دنوں سمرقند کے، مدرسہ الغ بیگ میں مدرس تھے۔ میں نے ان کے حالات اور کیفیاتِ جذب واستغراق کے بارے میں سن رکھا تھا۔

جب وہ مدرسے میں درس دے رہے تھے، میں بھی وہیں چلا گیا، اور مدرسے کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ جب وہ درس سے فارغ ہوئے، اور مجھے دیکھا تو فرمایا: تم نے خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، خود ہی جواباً کہنے لگے: خاموشی کی دو قسمیں ہیں: ایک تو ان لوگوں کی خاموشی ہے جو دنیا کو عبور کر کے جلدی سے گزر جانے والے ہیں۔ ان خاموش رہنے والوں کی خاموشی ان کے لیے باعثِ برکت ہے۔ اور دوسرے ان لوگوں کی خاموشی ہے جو اسی دنیا میں اٹکے ہوئے ہیں۔ ان کی خاموشی ان کی چال ہے۔

خواجہ عبید اللہ فرمایا کرتے تھے: میں نے مذکورہ بالا استاد (یعنی مولیٰ نظام الدین خامرس) کے کلام سے ان کی جلالتِ قدر کو پہچانا''۔

خواجہ عبید اللہ کا مسلک اہل السنۃ والجماعۃ کے اعتقادات کو اپناتے ہوئے، احکامِ شریعت کے سامنے انقیاد، اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کی کامل اتباع کے ساتھ ساتھ دوامِ عبودیت تھا۔

دوامِ عبودیت: جنابِ حق تعالیٰ کے ماسویٰ کے شعور سے ہٹ کر، بس جنابِ حق کے ملاحظہ کا نام ہے۔

آپ ہی کا قول ہے: ''توحید اسے کہتے ہیں کہ: اللہ کے ماسویٰ کے شعور سے قلب کو بالکل خالی کر لیا جائے''۔

مزید کہتے ہیں: ''وحدت تو یہ ہے کہ: دل کو اللہ کے ماسویٰ موجودات کے علم سے بھی خالی کر لیا جائے''۔

آپ ہی کا کہنا ہے: ''حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں استغراق کا نام استغراق ہے''۔

مزید فرماتے ہیں: ''سالک کا اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں اپنے آپ سے بھی خالی دل ہونا سعادت کی علامت ہے، اور حق سے منقطع ہو کر نفس کی طرف ملتفت ہو جانا شقاوت کی علامت ہے''۔

اور فرماتے ہیں: ''نورِ حق کے مشاہدے میں انسان اپنے آپ کو بھی بھول جائے، اسے وصل کہتے ہیں۔ اور اللہ کے ماسویٰ سے مخفی باتوں کو قطع کر دینا فصل کہلاتا ہے''۔

مزید کہتے ہیں: ''سکر: دل پر ایسے غلبۂ حال کو کہتے ہیں کہ جس کے ہوتے ہوئے آدمی ان چیزوں کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا، کہ جنہیں چھپانا ضروری ہوتا ہے''۔

...... موصوف کی وفات ۸۹۵ھ میں ہوئی۔ آپ کی قبر شریف سمرقند میں ہے۔
(الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيه ۱: ۲۷۸ - ۲۹۳، سے مختصر حالات کا تذکرہ مکمل ہوا)۔

۱۲ : طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب: الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيَة" میں کہا ہے:

"خوب جان لو کہ: طریقۂ نقشبندیہ کی انتہا شیخ خواجہ بہاء الدین نقش بندی رحمہ اللہ تک ہے۔ اس مقام پر ہم اس طریق کے بعض مناقب وفضائل ذکر کرتے ہیں۔ .... چنانچہ ہم کہتے ہیں:

اس طریق تصوّف کی بنیاد خواجہ بہاء الدین نقش بندی قدّس سرّہ العزیز ہیں۔ آپ کا اسمِ گرامی محمد بن محمد بخاری ہے۔ طریقت میں آپ کی نسبت سید امیر کلال کی طرف تھی، اور آپ نے انہیں سے ذکر کی تلقین حاصل کی تھی۔ مزید برآں آپ نے شیخ عبد الخالق غجدوانی کے روحانی فیوضات سے بھی تربیت پائی۔

آپ کے طریق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ: کسبی ہے، اور یہ بھی کہ: موروثی ہے۔ جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: "کششِ حق کا کچھ ایسا حصہ مجھے عطا کیا گیا ہے جو جن وانس کے عمل کے مساوی ہے"۔

اور جب آپ سے آپ کے طریق کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: "کثرت میں خلوت، باطن کی توجہ حق کی جانب اور ظاہر کی توجہ مخلوق کی طرف ہونا اس طریق کی حقیقت ہے"۔

پھر ارشاد فرمایا: "اس طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی اشارہ کرتا ہے: "رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ"، یعنی: وہ ایسے لوگ ہیں جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی"۔

آپ اعلانیہ ذکر (یعنی بالجہر) نہیں کیا کرتے تھے۔ اور اس پر معذرتاً کہتے تھے کہ: "درحقیقت شیخ عبد الخالق غجدوانی نے مجھے عزیمت پر عمل کرنے کا تاکیدی حکم دیا تھا، اسی لیے میں نے اعلانیہ ذکر (بالجہر) چھوڑ دیا ہے"۔

آپ کے پاس کوئی غلام تھا نہ باندی۔ جب آپ سے اس بارے میں کہا گیا تو فرمایا: "بندہ اس لائق نہیں ہے کہ سید (وآقا) بنے"۔

آپ (دوسروں پر تہمت دھرنے کی بجائے) اپنے آپ کو الزام دینے کی نصیحت کے ساتھ ساتھ، نفس کے مکر وفریب اور چالوں سے ہوشیار رہنے کی تاکید کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ: "نفس کی چالبازیوں کی معرفت کے بعد ہی آدمی طریق تصوّف کی حقیقت تک پہنچ پاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قول: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰهِ، میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: مؤمن کو چاہیئے کہ ہر دم طبعی وجود کی نفی کرتے ہوئے اپنے حقیقی معبود کا اثبات کرتا رہے"۔

مزید فرمایا کرتے تھے: "میرے نزدیک طریقت کا قریبی ترین راستہ وجود کی نفی ہے، لیکن یہ مرتبہ اختیار کے ترک اور اپنے اعمال میں کمی کوتاہی دیکھتے رہنے سے ہی حاصل ہوتا ہے"۔

مزید فرمایا کرتے تھے: "اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ سے تعلق رکھنا، سالک کے لیے بہت بڑا حجاب ہے"۔

اور فرمایا کرتے تھے: "ہمارے طریقہ تو بس صحبت اختیار کرنا ہے، اور جمعیت میں اس شرط کے ساتھ خیر ہے کہ ساتھی آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتے رہیں۔ اور خلوت میں شہرت ہے، اور شہرت میں آفت ہے"۔

ں قاری نے انہیں اپنی کتاب "المرقاۃ" میں: "ہمارے شیخ" (۱۷) "سید" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

ملاعلی قاری کے اساتذہ میں مشہور و معروف عالم، مسند حرم شیخ علی بن حسام الدین متقی حنفی بھی ہیں۔ان کا انتقال ۹۷۵ھ ہجری میں ہوا۔ملاعلی قاری نے مرقاۃ المفاتیح کے مقدمہ میں بایں اوصاف یاد کیا ہے: باعمل عالم، باکمال فاضل، عارف باللہ، ولی کامل مولانا علی۔ اللہ ان کی رفیع المرتبت برکات میں سے ہمیں بھی حصہ عطا فرمائے۔مزید برآں ملاعلی قاری رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں ان کی بعض عادات کے بارے میں بڑی عجیب وغریب حکایات نقل کی ہیں۔(۱۸)

......آپ ہی کا ارشاد ہے: "ہمارا طریقہ تو بہت مضبوط کڑا ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے آثار، اور آداب کی متابعت پر ہے"۔

یہ بھی فرمایا: "طالب کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ: سب سے پہلے اپنے احوال کو پہچانے۔پھر جب اہلِ طریق میں سے کسی کی صحبت اختیار کرے اور اپنے احوال میں (مثبت) زیادتی محسوس کرے، تو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اسے مضبوطی سے پکڑ لے کہ: "أَصَبْتَ فَالْزَمْ"، یعنی: تم ٹھیک راہ پر ہو، اسے مضبوطی سے تھامے رہو"۔

آپ کی وفات پیر کی شب، ۳ ربیع الاول ۹۷۱ھ، کو ہوئی۔

(الشقائق النعمانیہ ۱: ۲۸٤ - ۲۸٦).

۱۷: دیکھیے: "مرقاۃ المفاتیح" (۳: ۲۱۱، طبع مصر).

۱۸: دیکھیے: "مرقاۃ المفاتیح" (۲: ٤۷۰). چنانچہ آپ نے حدیث: "أَذْكُرْ هَاذِمَ اللَّذَّاتِ" کی شرح میں کہا ہے:

"ہمارے شیخ عارف باللہ تعالیٰ مولانا نور الدین علی متقی ایک تھیلی بنوا کر، اس پر لفظ: "موت" لکھ کر، مریدین کی گردن میں ڈال دیتے تھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ: انہیں یہ دھیان رہتا کہ: موت قریب ہی ہے، دور نہیں، چنانچہ وہ امیدیں گھٹا کر، عمل زیادہ کرتے"۔

کئی ائمہ نے آپ کے حالاتِ زندگی پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ان میں سے علامہ شیخ عبد القادر بن احمد فاکہی (ت ۹۸۹ھ) ہیں، جن کی کتاب کا نام "اَلْقَوْلُ النَّقِي فِي مَنَاقِبِ الْمُتَّقِي" ہے۔چنانچہ شیخ عبد القادر عیدروسی (ت ۱۰۳۸ھ) نے اپنی کتاب: "اَلنُّورُ السَّافِرُ عَنْ أَخْبَارِ الْقَرْنِ الْعَاشِرِ" میں آپ کے حالات ذکر کرتے ہوئے فَاكِهِي کی کتاب سے نقل کیا ہے۔آپ کے حالات پر تصنیف کرنے والوں میں سے شیخ عبد الوہاب (ت ۱۰۰۱ھ) بھی ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب کا نام "إِتْحَافُ التَّقِي فِي فَضْلِ الشَّيْخِ عَلِيٍّ الْمُتَّقِي" رکھا تھا۔

مؤرخ صدیق حسن قنوجی (ت ۱۳۰۷ھ) اپنی کتاب "أبجدُ العُلوم" میں رقم طراز ہیں:

"أَبَانَ فِيْهِ عَنْ فَضَائِلِهِ الْكَثِيْرَةِ، وَهُوَ حَقِيْقٌ بِذَٰلِكَ".

کہ: "شیخ عبد الوہاب نے اپنی کتاب "إِتْحَافُ التَّقِي" میں، شیخ علی متقی کے بہت سے فضائل کا ذکر کیا ہے، اور وہ واقعی اس لائق بھی تھے"۔

محدث فقیہ شیخ عبد الحق بن سیف الدین بخاری دہلوی نے بھی آپ کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کیا تھا۔چنانچہ قنوجی نے کہا ہے:

"ذَكَرَ لَهُ الشَّيْخُ عَبْدُ الْحَقِّ الدِّهْلَوِيُّ تَرْجَمَةً حَافِلَةً فِي الْمَقْصَدِ الْأَوَّلِ مِنْ كِتَابِهِ "زَادِ الْمُتَّقِيْنَ فِي سُلُوكِ طَرِيقِ الْيَقِيْنِ" وَأَثْنَى عَلَيْهِ كَثِيْرًا وَحَرَّرَ أَحْوَالَهُ الشَّرِيفَةَ فِي أَبْوَابِ خَمْسَةٍ تَامٍّ".

......

ملا علی قاری کے اساتذۂ حدیث میں مسندِ حرم، خاتمة المحققين، حافظِ حرم علامہ شیخ ابو عباس شہاب الدین احمد بن محمد سعدی انصاری شافعی مکی بھی ہیں جو کہ ابن حجر (۱۹) ہیتمی کے نام سے معروف ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۷۳ھ میں ہوئی۔ ان کا ذکر "مرقاۃ

......کہ: شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب "زَادِ الْمُتَّقِيْنَ فِي سُلُوكِ طَرِيقِ الْيَقِيْنِ" کے مقصدِ اوّل میں آپ کا تفصیلی ترجمہ لکھا ہے۔ (ترجمہ لکھنا حالاتِ زندگی بیان کرنے کو کہتے ہیں)۔ اور آپ کی انتہائی تعریف کرتے ہوئے مکمل پانچ ابواب میں آپ کے احوال تحریر فرمائے ہیں۔
آپ کے حالاتِ زندگی کے لیے درج ذیل کتب دیکھیے:

۱ : شعراني، لواقح الأنوار في طبقات الأخيار ۱: ۱۸۵، مصر، ۱۳۷۳ھ.

۲ : الغزي، الكواكب السائرة في أعيان المئة العاشرة ۲ : ۱۲۱ - ۲۲۲، بيروت، ۱۹۵۸ء.

۳ : غلام علي آزاد، سبحة المرجان في آثار هندوستان ص ۴۳، بمبئي، هند، ۱۳۰۳ھ.

٤ : عبد الحيّ حسني، نزهة الخواطر ٤ : ۲۳٤ - ۲٤٤، حيدر آباد، الدكن، ۱۳۷٤ھ.

۱۹ : مشہور مؤرخ محی الدین عبدالقادر عیدروسی نے اپنی کتاب "اَلنُّورُ السَّافِرُ عَنْ أَخْبَارِ الْقَرْنِ الْعَاشِرِ" میں ابن حجر مکی کے حالات بایں الفاظ نقل کیے ہیں:

"آپ کی ولادت رجب ۹۰۹ ہجری میں ہوئی۔ آپ کے بچپن ہی میں آپ کے والد کی وفات ہوگئی تھی۔ چنانچہ آپ کی کفالت کی ذمہ داری علم وعمل کے دو کامل اماموں نے اٹھائی۔ ایک تو عارف باللہ شمس الدین ابن ابی حمائل تھے، اور دوسرے شمس الدین شناوی تھے۔
پھر شیخ شمس شناوی آپ کو آپ کے آبائی علاقہ: (محلۂ ابی ہیتم) سے، قطب شریف سیدی احمد بدوی (اللہ تعالیٰ ان کی ذات سے نفع پہنچائے) کے پاس لے گئے۔ آپ نے وہاں مذکورہ بالا دونوں حضرات سے ابتدائی علوم کی تحصیل مکمل کی۔
جب آپ کی عمر تقریباً چودہ سال کی ہوئی، تو شیخ شناوی نے ۹۲۴ھ میں، آپ کو جامع ازہر میں ایک ایسے صالح عالم کے سپرد کیا جو شیخ شناوی اور ابن ابی حمائل دونوں کے شاگرد رہ چکے تھے۔ انہوں نے آپ کی خوب نگہداشت کی، اور آپ کو صغر سنی ہی میں مصر کے علماء کی ایک جماعت کے پاس لے گئے۔ چنانچہ آپ نے ان علماء سے علوم وفنون کو حاصل کیا۔ قرآن مجید تو آپ بالکل بچپنے ہی میں حفظ کر چکے تھے۔ وہ مشائخ جن سے آپ نے استفادہ کیا، ان میں شیخ الاسلام قاضی زکریا شافعی، معمر شیخ امام زینی عبدالحق سنباطی، شہاب رملی، امام ابوالحسن بکری وغیرہ جیسے اساطین شامل ہیں۔ ان علماء میں سے بعض نے بیس برس کی عمر سے بھی کم میں، آپ کو افتاء اور تدریس کی اجازت دے دی تھی۔
آپ تفسیر، حدیث، علم کلام، اصول فقہ اور فروع وغیرہ جیسے بہت سے علوم میں ماہر تھے۔ علمِ فقہ میں آپ کی محفوظات میں سے "المنهاج للنووي" بھی ہے۔ آپ کی قراءت شدہ چیزیں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی گنتی بھی دشوار ہے۔ جن مشائخ نے آپ کو روایتِ علوم وفنون کی اجازات دی ہیں، وہ بھی بہت زیادہ ہیں، جنہیں آپ نے خود ہی اپنے مشائخ کی معجم میں جمع کر دیا ہے۔
آپ ۹۳۳ھ میں مکہ آئے اور حج کیا۔ اور آئندہ سال حرم مکہ ہی کی مجاورت میں گزاری۔ پھر مصر واپس لوٹے، اور ۹۳۷ھ کے آخر میں اپنے اہل وعیال سمیت حج کیا۔ اگلا حج آپ نے ۹۴۰ھ میں کیا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور اس قیام کے دوران تالیف وتصنیف اور فتویٰ نویسی کے ساتھ ساتھ، موت تک تدریس میں مشغول رہے۔ اس لحاظ سے آپ کی مکہ میں اقامت کی مدت تینتیس (۳۳) سال بنتی ہے۔ آپ کی زندگی کے مزید حالات کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کریں:

المفاتیح لمشکاۃ المصابیح" میں ان کا تذکرہ ان الفاظ سے موجود ہے: "ہمارے شیخ، عالم بے بدل، شیخ الاسلام، مفتی خلق، کثیر کتب اور مشہور تالیفات والے ہمارے علم کی سند، مولانا سیدنا شیخ شہاب الدین ابن حجر مکی" (۲۰)۔ بااین ہمہ ملا علی قاری اپنی اسی شرح میں جا بجا ان پر تعقب کرتے اور مناقشہ کرتے ہیں۔

ملا علی قاری کے اساتذہ حدیث میں مشہور عالم، محدث اور مسند حجاز شیخ عبداللہ سندی (۲۱) بھی ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۹۶ھ میں ہوئی۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب "فتح المغطأ شرح الموطأ للإمام محمد" میں ان کا تذکرہ "میرے استاذ" کہہ کر کیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ کتاب کے مقدمے میں کہتے ہیں:

---

۱ : غزي، الكَوَاكِبُ السَّائرة ۳ : ۱۱۱.

۲ : خفاجي، ريحانة الألباء ص ۲۱۱ – ۲۱۲.

۳ : ابن عماد، شذراتُ الذَّهَب ۸ : ۳۷۰ – ۳۷۲.

۴ : اس کے علاوہ ہماری کتاب: فوائدِ جامعہ بر عجالۂ نافعہ (ص ۳۳۳) ملاحظہ کریں، اس میں کئی قیمتی فوائد ہیں۔

۲۰ : دیکھیے: "مرقاة المفاتيح" (۱ : ۲۵، طبع مصر).

۲۱ : شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ت ۱۰۵۲ھ) نے اپنی فارسی کتاب: "أخبارُ الأخيَار في أسرَارِ الأبرَار" (المطبعة المجتبائية ۱۳۳۲ھ، ص ۲۸۰) میں موصوف کے ترجمہ میں کہا ہے:

"شیخ عبداللہ اور شیخ رحمۃ اللہ- اللہ کی ان دونوں پر رحمتیں ہوں- دونوں سندھی علماء میں سے ہیں، لیکن مدینہ منورہ (میں مستقل رہائش اختیار کر لینے کی وجہ سے مدینہ منورہ ہی) کی جانب منسوب ہیں۔ یہ دونوں حضرات فقہاء صوفیہ میں سے تھے، اور مدینہ مطہرہ سے ہندی دیار کی جانب چلے گئے تھے، اور حدیث نبوی شریف کے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچایا، حتیٰ کہ طلبہ انہیں "شیخین" کے نام سے جانتے پہچانتے اور پکارتے تھے۔

خواجہ عبدالشہید عبیداللہ رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ: یہ دونوں حضرات تو ہمیں شیخین یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔

یہ دونوں عالم علم و عملِ صالح اور تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے، کسی کا ان کے قریب پہنچنا بھی محال سمجھا جاتا تھا۔ ان کے بارے میں طلبہ کا یہ اعتقاد تھا کہ: حرمین شریفین سے ان دونوں حضرات جیسا کوئی بھی عالم ہندوستان میں نہیں آیا۔ دونوں ہی علی متقی کے رفقاء اور خلفاء میں سے تھے۔ عثمانی خلیفہ کی جانب سے مکہ مکرمہ میں تعینات شدہ حکام شیخ علی متقی کے پاس آیا کرتے تھے، اور آپ انہیں، اپنے بعض مریدین اور فقراء خدام کے لیے کچھ وظائف دینے کی ترغیب دے دیتے تھے۔ مگر آپ نے ایسے وظائف اور عطیات کبھی بھی نہ تو شیخین کے لیے قبول کیے اور نہ ہی سید عبد الوہاب کے لیے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے وظائف عموماً شک و شبہ سے خالی نہیں ہوتے۔

شیخ رحمت اللہ کے والد قاضی عبداللہ، بعض حوادث کی بنا پر اہل و عیال سمیت مدینہ منورہ کی طرف جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں احمد آباد نامی شہر میں کچھ عرصہ ٹھہرے اور وہیں شیخ علی متقی سے ملاقات ہوگئی، اور بس پھر تو انہی کے ہو کے رہ گئے۔ جب حجازِ مقدس پہنچے تو مدینہ منورہ کو......

میں نے اس کتاب (یعنی موطا امام محمد) کی پشت پر اپنے استاد شیخ عبداللہ سندی رحمہ اللہ کی یہ تحریر دیکھی ہے کہ: یہ موطا مالک بن انس، محمد بن حسن والی روایت ہے۔ جبکہ یہ بات قابل اشکال ہے۔ اس لیے کہ امام محمد اس کتاب میں امام مالک (۲۲) کے علاوہ دوسرے

......اپنا وطن بنالیا، اور کچھ ہی عرصہ بعد اپنے رب تعالیٰ سے جاملے۔

شیخ عبداللہ موصوف، قاضی عبداللہ کے رفیق اور ساتھی تھے۔ ان کی نشو ونما اور پرورش مدینہ منورہ ہی میں ہوئی، اور وہیں افادۂ علمی اور عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ پھر بعض حوادث کی بنا پر مدینہ منورہ سے ۹۷۷ھ میں واپس دیار ہند کی طرف لوٹ آئے۔ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد، ایک مدت تک احمد آباد نامی شہر ہی میں قیام پذیر رہے، کیونکہ ان کے آباء واجداد کا وطن یہی تھا۔

کئی سال اسی طرح گزرنے کے بعد شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ کسی لاعلاج قسم کی بیماری میں مبتلا ہوگئے، جس سے جسم کے اعضاء کو حرکت دینے کی قوت ختم ہوجاتی ہے۔ (غالباً فالج کی کوئی قسم ہوگی)۔ بہر حال، تب یہ دونوں حضرات احمد آباد سے حجاز چلے گئے۔ ان دونوں اصحاب کے مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد ان دونوں کی وفات ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان پر اور تمام نیکوکار لوگوں پر رحمت نازل کرے۔ آمین۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "زَادِ الْمُتَّقِيْنِ فِي سُلُوكِ طَرِيقِ الْيَقِيْنِ" میں ان کے حالات کو بایں الفاظ نقل کیا ہے:

عبداللہ سندی از اصحاب علی متقی ست، وشاگرد ابن حجر مکی در علم عربیت استفادہ می کرد، واکثر احوال می گفت: اعربوا لنا هذا الكلام. دانش مند بود و مرد خدا از ہیچ کس طمع وبا ہیچ کس کارے نداشت، برائے خدا درس وافادہ نمودے، وتصحیح کتب حدیث کردے، نسخہ مشکاتے بدست خود بعنایت تصحیح نمودہ وتحشیہ کردہ، وورق ورق ساختہ تا بسیار کس در یک مجلس ازاں استفادہ می کردند، وانتساخ می کرد، ودر حواشی اثبات مذہب حنفی نمودہ ودلائل آن آوردہ است، می گفت من مشکاۃ را حنفی ساختہ ام، ومی گفت کہ در تمام عمر خود کارے کہ کردہ ام ایں مشکاۃ است۔ امیدوارم کہ خدائے تعالیٰ مرا بداں بخشد۔ مَاتَ رَحِمَهُ اللهُ فِي ۹۹۶ھ۔

ترجمہ: عبداللہ سندی، شیخ علی متقی رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے تھے۔ انہوں نے ابن حجر مکی سے علم حاصل کیا، اور ابن حجر مکی عربیت میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے، اور کئی مرتبہ کہا کرتے: ہمیں اس کلام کی عربی عبارت بنادو۔

موصوف عالم اور اللہ والے آدمی تھے۔ لوگوں سے کنارہ کش اور محض اللہ کے لیے درس وتدریس میں مشغول رہتے ہوئے طلبہ کو فائدہ پہنچاتے۔ حدیث کی کتب کی تصحیح کرتے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے مشکاۃ المصابیح کا نسخہ لکھا تھا جو صحت کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ پھر اس نسخے پر حاشیہ بھی لکھا، اور اسے ایک ایک علیحدہ علیحدہ ورق پر نقل کیا، جس کی بنا پر کئی لوگ اس سے ایک ہی مجلس میں استفادہ کرسکتے تھے۔ موصوف نے اس کے حواشی میں مذہب حنفی کے اثبات کے دلائل نقل کیے تھے۔

آں موصوف اس نسخے کا حاشیہ لکھتے ہوئے کہا کرتے تھے: "میں نے اس حاشیے سے "مشكاة المصابيح" کو حنفی بنادیا ہے"۔

کہا کرتے تھے: ساری عمر میں ایسا عمل جو میں نے کیا ہو اور مجھے اس کی بنا پر اللہ سے مغفرت کی امید ہو، وہ یہی "مشكاة المصابيح" کی خدمت کا عمل ہے۔ آپ کی وفات ۹۹۶ھ میں، مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

مزید دیکھیے: "تقصار جيود الأحرار للنواب صديق حسن خان قنوجي، المطبعة الشاهجهانية، بھوپال، ہند: ۱۲۹۸ھ، ص ۱۰۰.

۲۲: دیکھیے: "فَتْحُ الْمُغَطَّا شَرْحُ الْمُوَطَّا"۔ اس کتاب کا ایک خطی نسخہ "پیر وہب اللہ شاہ"، صاحب عَلَم کے کتب خانہ میں، سندھ کی بستی پیر جھنڈو میں محفوظ ہے۔ اور ہم نے اس کتاب کا ایک دوسرا، مذکورہ بالا نسخہ سے بہتر مخطوط سندھ میں، عالم کبیر محمد ہاشم جان مجددی کے ہاں، بستی ٹنڈو سائیں داد میں دیکھا ہے۔

محدثین، جیسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان جیسے مزید محدثین سے بھی روایت کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے اغلب روایات پر نظر کر کے یہ حکم لگا دیا ہے۔

ملا علی قاری نے مسند امام اعظم بروایت حصکفی پر اپنی شرح میں انہیں: ''ہمارے شیخ، مولانا'' کے الفاظ سے ذکر کیا ہے(۲۳)۔

ملا علی قاری کے اساتذۂ حدیث میں علامہ حافظ اپنے زمانے کے مسند حدیث، صاحب طبقات حنفیہ، مفتی مکہ شیخ قطب الدین (۲۴)

---

۲۳ : دیکھیے: "مسندُ الإمامِ الأعظم، بروایة حصکفي، مع شرح ملا علي قاري": (ص ٤، المطبع المجتبائية، دهلي هند ١٣١٣ هـ.

۲۴ : غزی "الكَواكِبُ السَّائِرَةِ بِأعيانِ المِئَةِ العَاشِرَة(۳:۴۴)" میں آپ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''محمد بن احمد علاء الدین بن محمد بن قاضی خان بن بہاء الدین بن یعقوب بن حسن بن علی نہروانی۔ (النہروالی: اگر لام کے ساتھ ہو تو ''نہر والہ'' کی طرف نسبت ہے، جو ہندوستان میں گجرات میں واقع شہر کا نام ہے)۔ موصوف شیخِ وقت، امام، علامہ، محقق مدقق، ذی فہم، شیخ قطب بن شیخ علاء الدین، اصلاً نہروانی (نہروالی) ہندی، مکی، حنفی تھے۔ اور میں نے ان کے نسب کے بارے میں جو کچھ نقل کیا ہے وہ میں نے ان کے اپنے قلم کی اس تحریر میں پڑھا ہے، جس میں انہوں نے شیخ الاسلام سے یہ استدعاء کی ہے کہ ... ان کی شہرت شیخ قطب الدین ہندی سے تھی۔ ان کی پیدائش ۹۱۷ ھ میں ہوئی، جیسا کہ میں نے ان کی اپنی تحریر میں پڑھا ہے۔

آپ نے جن مسندینِ حدیث سے روایت کی ہے، ان میں سب سے بڑے شیخ عبد الحق سنباطی ہیں۔ اور ان کے مشائخ میں سے سب سے عظیم القدر عالم ان کے والد اور شیخ محمد تونسی، شیخ ناصر الدین لقانی، شیخ احمد بن یونس بن شلبی اور شیخ جمال الدین حرباتی ہیں۔ آپ شیخ الاسلام کے ساتھ مکہ اور شام میں مجتمع ہوئے۔ پھر انہیں کتابی طور پر اجازتِ حدیث کی استدعاء ۹۷۷ ھ میں لکھی، کہ وہ انہیں اور ان کی اولاد کو اجازتِ حدیث دے دیں، چنانچہ انہوں نے انہیں اس کی اجازت دی تھی.... ابن حنبلی نے اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں: انہیں دو زبانوں ترکی اور فارسی میں بھی مہارت تھی۔ آپ کی تالیفات میں سے ایک "طَبَقَاتُ الحَنَفِيَّة" ہے، جو ان کی باقی کتب کے ساتھ جل گئی تھی''۔

میں کہتا ہوں: مکہ مشرفہ میں مجھے ان کی کتب کی تاریخ ملی تھی۔ موصوف فقہ، تفسیر، عربیت اور نظمِ شعر میں ماہر تھے۔ آپ کی نظم انتہائی رقیق القلب ہوا کرتی تھی۔

عبد الحئی حسنی اپنی کتاب: نزهة الخواطر (٤ : ٢٨٦) میں رقم طراز ہیں:

''آپ کی ولادت لاہور میں ہوئی، ....علم کی تحصیل اپنے والد صاحب سے کی۔ پھر مکہ مشرفہ کا سفر کیا، اور خطیب عصر احمد محب الدین ابن ابی القاسم محمد عقیلی نویری مکی، محدث یمن وجیہ الدین عبد الرحمٰن بن علی ربیع شیبانی زبیدی، نزیلِ حرمین شیخ شہاب الدین احمد بن موسے بن عبد الغفار، اصلاً مغربی، پھر مصری، اور شیخ محمد بن محمد بن عبد الرحمٰن خطاب مالکی، اور ان کے والد شیخ محمد بن عبد الرحمٰن وغیرہ جیسے اجل علماء سے علم حاصل کیا۔

اس کے بعد ۹۴۳ ھ میں مصر چلے گئے، اور وہیں متوکل علی اللہ ابو عبد اللہ محمد بن یعقوب عباس سے ۹۵۰ ھ میں ملاقات ہوئی۔ اس بات کی صراحت انہوں نے تاریخ مکہ میں کی ہے۔

مزید کہتے ہیں: میں اور شیخ عباسی مصر میں اکٹھے ہوئے، اور میں نے ان سے ۹۴۳ ھ میں، مصر کی جانب طلبِ علم کی خاطر کیے.....

...... جانے والے سفر میں حدیث کو اخذ کیا۔ ان دنوں مصر بڑے بڑے علماء کی آماجگاہ تھا، فضلاء سے بھرا ہوا، اور مشائخ کرام کی برکات کی وجہ سے ایسے بابرکت بقعہ تھا، گویا کہ ایک دلہن چاند تاروں کے درمیان گھری ہوئی ہو۔

اب مرورِ زمان کے ساتھ، وہ سال، اور ان دنوں کے بسنے والے لوگ ایسے بھولے بسرے ہو گئے ہیں گویا وہ ایام اور وہ بابرکات ہستیاں، سب ایک خواب تھا جو کسی نے کبھی دیکھا تھا۔

اور تاریخ مکہ میں انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ: انہوں نے طریقِ تصوف کو شیخ علاء الدین کرمانی نقش بندی (ت ۹۳۹ ھ) سے حاصل کیا تھا۔ شاید یہ ان کے مصر کے سفر سے پہلے کا قصہ ہو۔

موصوف کی صحیح بخاری کی سند اتنی عالی ہے کہ ساری دنیا میں اس قدر عالی سند والا کوئی عالم میرے علم میں نہیں ہے"۔ (حافظ سید عبدالحیٰ کتانی نے اپنی کتاب "فَهرِسُ الفَهارِسِ وَالأثبات" میں، موصوف کے ترجمہ میں اس سند پر ایسی سیر حاصل بحث کر دی ہے کہ اس کے بعد مزید کلام کی گنجائش باقی نہیں ہے)۔

میں کہتا ہوں: قاضی محمد بن علی شوکانی نے "البدر الطّالع" میں ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ شرفاءِ مکہ کو انشاء پردازی لکھ کر دیا کرتے تھے، اور آپ فصاحت و بلاغت میں فائق تھے، جسے ہر وہ آدمی جان سکتا ہے، جس نے ان کی تالیف: "البَرقُ اليَمَاني في الفَتحِ العُثمَاني" دیکھ رکھی ہو۔ اس تالیف میں بیت اللہ الحرام کی جلیل القدر ہستیوں کے حالات کو جمع کیا گیا ہے۔ ترکوں کے ہاں آپ کی انتہائی قدر و منزلت تھی۔ اور ان کے سرداروں میں سے کوئی بھی اس وقت تک حج نہیں کرتا تھا جب تک کہ آپ ان کے ساتھ نہ ہوتے، اور آپ کے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ وہ تیار نہ ہوتے تھے۔

ترک آپ کی خدمت میں بڑی لمبی رقمیں ہدیۃً پیش کرتے تھے، اور اس طرح جو رقم حاصل ہوا کرتی تھی، آپ اس سے عمدہ عمدہ کتب خریدتے، یا ضرورت مندوں پر خرچ کر دیتے۔ اسی بنا پر نادر کتب کا ایسا ذخیرہ آپ کے پاس جمع ہو گیا تھا، جو کسی دوسرے کے پاس کم ہی جمع ہوا ہوگا۔ آپ کی عادت تھی کہ: اکثر باغوں میں تفریح کے لیے جایا کرتے۔ اکثر علماء اور ادباء کی ایک جماعت کے ساتھ طائف کی جانب نکل جاتے، اور ان سب کا خرچہ آپ خود اٹھاتے۔

آپ کی تصانیف کئی ایک ہیں، ان میں سے بہترین کتاب: الإعْلَام بِأعْلَامِ بَيْتِ اللّٰهِ الحَرَامِ" ہے۔ آپ نے اسے ۹۵۸ ھ میں تصنیف کیا تھا... آپ کی تصنیفات میں سے: "البَرقُ اليَمَاني في الفَتحِ العُثمَاني" بھی ہے، جس میں وزیر سلیمان پاشا کے ہاتھوں پہلی عثمانی فتح کے بعد سے لے کر مؤلف کے زمانے تک کی یمن کی تاریخ ہے۔ موصوف نے اسے وزیر سنان پاشا کی فرمائش پر اس کے لیے تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کا نام: "الفتوحات العثمانية، للأقطار اليمنية" بھی ہے"۔

آپ کی چند مزید تصنیفات یہ ہیں: "منتخب التاريخ في التَّراجم"، "تمثال الأمثال النادرة والتمثيل والمُحاضرة بالأبيات المُفرَدَةِ النَّادِرَة" اور "الكَنزُ الأسْمىٰ فِي فَنِّ المُعَمّىٰ"۔

عبدالقادر عیدروسی نے "النُّورُ السَّافِر" میں کہا ہے:

"شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ کے افادات میں سے یہ بھی ہے کہ: لفظ "ابن خلّكان" کا ضبط دو فعلوں کی صورت پر کیا گیا ہے،......

مکی حنفی بھی ہیں۔ موصوف کی وفات ۹۹۹ھ میں ہوئی۔ چنانچہ اپنی: "بَیَانُ فِعْلِ الخَیْرِ إِذَا دَخَلَ مَکَّةَ مَنْ حَجَّ عَنِ الغَیْرِ" نامی کتاب میں انہیں "عُمدَةُ المُتَأخرِین، زُبدَةُ المُتَبحرِین، ہمارے شیخ، اللہ کے امن والے حرم میں مسلمانوں کے مفتی مولانا قطب الدین (۲۵) " جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

یہ ضبط و اتقان میں مشہور محدثین کی ایک جماعت ہے جنہوں نے ملا علی قاری کو اپنی مرویات کی اجازت دی، اور ملا علی قاری نے ان سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی مسندین حدیث علماء سے ملا علی قاری کو اجازت حدیث حاصل ہے۔

اور ان علماء میں سے عارف باللہ، فقیہ، محدث شیخ محمد بن ابو الحسن بکری (۲۶) مصری شافعی ہیں، جن کی وفات ۹۹۴ھ میں ہوئی۔ ملا علی قاری نے اپنے رسالہ: "شَمُّ العَوَارِض" میں انہیں: "ہمارے نیکوکار، مغفور شیخ محمد بن ابی الحسن بکری" کے الفاظ سے ذکر کیا ہے۔

......ایک تو لفظ: "خَلِّ" ہے، جو "خَلّی" یعنی: "تَرَكَ" فعل ماضی سے امر کا صیغہ ہے۔ اور "کان" ناقصہ ہے۔ یہ نام رکھے جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ: آپ اکثر یوں کہا کرتے تھے: "کَانَ وَالِدِيْ کَذَا"، اور "کَانَ جَدِّي کَذَا" یعنی: میرے والد یوں ہوا کرتے تھے ....، اور میرے دادا جان جو برامکہ میں سے تھے، وہ یوں ہوا کرتے تھے ...، تو ان سے کہا گیا: "خَلِّ کَانَ"، کہ: یہ "کَانَ" چھوڑ دے"۔

کہتے ہیں: "میں نے اس کا ضبط: لام کے سکون اور باقی حرکات کے اسی حال پر رہنے کے ساتھ بھی دیکھا ہے"۔ واللہ اعلم۔

عصامی نے "سِمْطُ النُّجُومِ العَوَالِي" (٤ : ٣٣٧) میں کہا ہے:

اس سال (یعنی ۹۹۰ھ) میں، ۲۶ ربیع الثانی، بروز ہفتہ، فجر ثانی کے قریب، اذان کے وقت، علامہ شیخ قطب الدین نہروالی کی بھی وفات ہوئی۔ موصوف حنفیہ کے مفتی تھے۔

۲۵ : اس کے لیے ان کا یہ رسالہ دیکھیے: "بَيَانُ فِعْلِ الخَيْرِ، إِذَا دَخَلَ مَكَّةَ مَن حَجَّ عَنِ الغَيْرِ" (ورقہ ۲۲۶)، ضمن مجموعۂ رسائلِ مخطوط، در مکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

۲۶ : ان کے بارے میں مؤرخ عبد القادر عیدروسی (ت ۱۰۳۸ھ) اپنی کتاب: "النُّور السّافر عن أخبار القرن العاشر" میں یہ الفاظ کہے ہیں:

وفي ربيع الثّاني سنة ثلاثٍ وتسعين توُفّي الأستاذ الأعظم، قطبُ العارفين الشّيخ محمَّد بن الشيخ أبي الحسن محمد .....، ابن أبي بكر الصديق ... البكري الصديقي الشافعي الأشعري المصري .... كان هذا الشيخ من آيات اللّٰه في الدرس والإملاء. فكانَ إذا تكلم فيه تكلم بما يُحَيِّر العقولَ ويُذهل الأفكار، بحيث لا يرتاب سامعه في أن ما يتكلم به ليس من جنس ما ينال بالكسب. وربما كان يتكلَّمُ فيه بكلام لا يفهمه أحدٌ من أهل مجلسه، مع كون كثير منهم أو أكثرهم على الغاية من التّمكّن في سائر مراتب العلوم الإسلامية، والإحاطة بفنونها.

فيذكر له ذلك بعد القيام من المجلس، فيقول: ليس ذلك بأعجب من حال المتكلّم به، فإني فيه مثلهم، كان إليه النّهاية في العلم، حتى كان بعض أئمة العلوم والمعارف هناك ممن أفنىٰ عمره في كسب العلوم الدينية والمعارف الربانية، يقول: واللّٰه لا ندرى من أين هذا الكلام الذى نسمعه من هذا الأستاذ؟ ولا نعلم له أصلا يؤخذ منه، ولو لا العلم بسد باب النبوة ، ......

......لاستدللنا بما نسمعه منه علیٰ نبوته.

اس سال، یعنی ۹۹۳ھ میں، ربیع الثانی میں عظیم استاد قطب العارفین شیخ محمد بن شیخ ابوالحسن محمد ....بن ابی بکر صدیق....بکری صدیقی شافعی اشعری مصری، کا انتقال ہو گیا۔ موصوف درس واملاء میں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ چنانچہ جب وہ بات کرتے تو عقلوں کو حیران کر دینے والی اور افکار کو تعجب میں ڈالنے والی ایسی گفتگو کرتے، جسے سننے والے کو اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہتا کہ جو باتیں آپ کر رہے ہیں، ایسی نہیں ہیں جنہیں کوشش سے حاصل کیا جا سکتا ہو۔

بعض اوقات آپ ایسی باتیں کر جاتے، جنہیں اہل مجلس میں سے شاید کوئی بھی سمجھ نہ پاتا، باوجودیکہ آپ کے پاس حاضر ہونے والوں میں سے بہت سے، بلکہ اکثر لوگ ایسے ہوتے تھے جو تمام اسلامی علوم وفنون کی باریکیوں کے انتہائی ماہر، جید استعداد کے مالک، اور پختہ علم والے ہوا کرتے تھے۔

اور اختتامِ مجلس کے بعد، جب آپ سے کسی بیان شدہ بات کے بارے میں کچھ کہا جاتا تو فرماتے: یہ بات مجھے بھی اتنی ہی حیران کن معلوم ہو رہی ہے، جتنی سننے والوں کو ہو رہی ہے، اور اس معاملے میں میرا حال بھی ان جیسا ہی ہے۔

اس زمانے میں آپ کو علم کا منتہیٰ شمار کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض ائمۂ علوم معارف ایسے بھی تھے جنہوں نے علومِ دینیہ اور معارف ربانیہ کی تحصیل میں عمریں فنا کر دی تھیں، مگر وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھے: اللہ کی قسم! جو کلام ہم اس استاد سے سنتے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے اخذ کردہ ہے؟ اور نہ ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے اس کلام کی اصل کیا ہے۔ اور اگر علم، نبوت کا دروازہ بند ہونے کے ساتھ ہی مخصوص نہ ہو گیا ہوتا، تو ہم ان سے سنی ہوئی باتوں کی وجہ سے ان کی نبوت پر استدلال کرتے''۔

مزید کہتے ہیں:

''آپ کی تفسیرِ قرآن کی مجالس، اس میں بیان ہونے والے دقیق معانی، اور گہری ابحاث کے ساتھ ساتھ سلف وخلف ائمۂ تفسیر کے اقوال کا استیعاب، پھر ان میں سے موصوف کے ہاں معتمد علیہ اقوال کا بیان، آیات اور سورتوں کے درمیان ربط اور مناسبت، ذاتِ مقدسہ کے اسماء وصفات کے درمیان مناسبت اور اس کے مواضع کا ذکر، اور تزکیہ وتصوّف کی رہنمائی کا حامل ہونے کی وجہ سے قرآن مجید کی ہر آیت کے ذیل میں ائمۂ طریقت کے بیان کردہ علومِ اشارہ کی توضیح وغیرہ، یہ سب ایسے امور ہیں جس سے عقلیں حیران، اور انسان ششدر رہ جاتا ہے۔

اور مستزاد یہ کہ جب آپ ان سب امور کو بیان کرتے تو خداداد فصاحت وبلاغت، روانی وجزالت اور انتہائی وضاحت سے، ایسے نپے تلے اور منتخب الفاظ سے بیان کرتے کہ اس کے بعد مزید توضیح وتشریح کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا تھا۔

پھر یہ بھی آپ کی امتیازی خصوصیت تھی کہ: آپ کی یہ ساری، یا اکثر تقریر مقفّع مسجّع برجستہ عربی اور اقتضائے مقام کے اتنا مطابق ہوتی کہ اس سے زیادہ موزوں الفاظ کا انتخاب ناممکن ہی ہوتا۔ مختلف علوم پر تقریر کے دوران، کوئی شخص، کبھی بھی آپ کے کلام میں اعراب، صرف ونحو، تقدیم وتاخیر یا ایسی کوئی دوسری لسانی غلطی نہیں نکال سکا۔ آپ کے ہر درس کی ابتدا ایک فی البدیہہ خطبہ سے ہوا کرتی تھی۔ اور اگر خطبہ فی البدیہہ نہ بھی ہوتا، تو بھی اس میں آئندہ بیان کیے جانے والے درس سے متعلق براعتِ استہلال کے انداز پر اشارات ضرور ہوتے تھے۔ آپ کی علم حدیث اور فقہ کی مجالس ایسی ہوا کرتی تھیں۔......

اورانہی اساتذہ میں عالم کبیر شیخ فقیہ بدرالدین شہاوی حنفی حرم مکہ کے مفتی بھی ہیں۔ ملا علی قاری نے ان کا تذکرہ اپنے رسالہ :"لسان الاهتداء في بيان الاقتداء" میں، بایں الفاظ کیا ہے:

ہمارے شیخ بدرالدین شہاوی حنفی ،حرم مکہ کے مفتی ......"۔(۲۷)

انہی اساتذہ میں سے ایک مشہور واعظ ،فقیہ شیخ سنان الدین یوسف بن عبداللہ اماسی رومی حنفی ہیں۔موصوف مکہ میں آ گئے تھے۔اور سنان الواعظ کے لقب سے مشہور تھے۔مناسک حج کے موضوع پر ان کی ایک کتاب "قرة العين" نامی بھی ہے۔تقریباً ۱۰۰۰ھ میں وفات پائی۔ملا علی قاری نے اپنے رسالہ :بیان فعل الخیراذ ادخل مکۃ من حج عن الغیر ، میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے: ہمارے شیخ، علماء کے لیے قابل فخر اور صالحین کا سرمایہ، مولانا سنان الواعظ رومی ......"۔(۲۸)

اوران میں شیخ مسند محمد بن علی بن احمد بن سالم جناحی بھی ہیں۔ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب:"مرقاة المفاتيح" کے مقدمہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

مجھے شیخ علامہ علی بن احمد جنانی ازہری شافعی اشعری انصاری سے اجازت عامہ اور رخصت تامہ حاصل ہے۔ اور انہوں نے

...... آپ جس علم پر بھی تقریر شروع کرتے، آپ کے درس میں اُس فن کے اصول وفروع کے حافظ اور پختہ کار ماہر سامعین بھی یہی رائے قائم کرتے کہ: آپ نے کسی بھی بحث میں، کسی دوسرے بولنے والے کے لیے کوئی نکتہ باقی نہیں چھوڑا۔اوراس فن میں آپ کے اختیارات اور ذاتی آراء مستزاد ہوا کرتیں۔

فضلاء مصر شعراء، علوم لغت ،شعری قواعد اور مذاہب انشاء کے ماہرین آپ کی اختتامی مجالس میں شامل ہوا کرتے ،آپ کی تعریف میں نئے نئے قصائد لکھتے ،اور آپ کی ایسی مجالس جن میں خواص وعوام موجود ہوتے ،ان سب ظاہری و باطنی نعمتوں ، یا کچھ مہتم بالشّان احسانات کا علیٰ رؤوس الاشہاد تذکرہ کرتے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کررکھے تھے۔

آپ کے بارے میں جو کچھ بھی بیان ہوتا، آپ اس میں کہنے والوں کے پاس بیٹھتے ،انہیں انعام بھی دیتے ،اوراپنے ان احباب کی خوشی ،اور ان کے حسن ظن کی رعایت کرتے ہوئے خوشی کا اظہار بھی فرماتے۔اللہ تعالیٰ ان کی برکات سے ہمیں بھی متمتع فرمائے۔

عیدروسی نے ان کے حالاتِ زندگی بہت بسط وتفصیل سے لکھے ہیں۔مزید دیکھیے:

۱ : غزی، الكواكب السائرة ۳ : ۶۷ - ۷۲.

۲ : ہماری کتاب :فوائد جامعہ برعجالۂ نافعہ (اردو)

۳ : دہلوی، شیخ عبدالحق: زَادُ الْمُتَّقِيْن فِي سُلُوكِ طَرِيقِ الْيَقِيْن (فارسی).

۲۷ : دیکھیے: لسان الاهتداء في بيان الاقتداء : ورقه ۲۵۷ ، ضمن مجموعہ رسائل ملا علی قاری مخطوط، درمکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

۲۸تا۳۲ : دیکھیے: بيان فعل الخير إذا دخل مكة مَن حجَّ عن الغير: ورقه ۳۳۶ ، ضمن مجموعہ رسائل ملا علی قاری مخطوط ، درمکتبہ کلیۃ شرقیہ، پشاور۔

کہا: میں نے شیخ الاسلام اور بڑے ائمہ کے امام شیخ جلال الدین سیوطی سے حدیث کی کئی کتب صحیح بخاری، صحیح مسلم، ان کے علاوہ کتب ستہ کے علاوہ دوسرے کئی علوم کی کتابیں بھی بعض تو قراءۃً، اور بعض سماعاً پڑھیں۔ اور انہوں نے مجھے اپنی تمام مرویات کی، اور جو کچھ ان پر پڑھا گیا سب کی اجازت دی۔ اور ان سب علوم کی بھی اجازت دی جس کی اجازت انہیں "خاتمۃ المحدثین مولانا شیخ ابن حجر عسقلانی نے قراءۃً، سماعاً، اجازۃً اور روایۃً دی تھی۔ اور علامہ علی جنائی نے مجھے ان کتب وعلوم کی بھی اجازت دی ہے، جو انہوں نے صاحبِ "المواھب" اور شارحِ بخاری شیخ قسطلانی کے سامنے پڑھی تھیں، اور وہ ابنِ حجر عسقلانی کے اجل تلامذہ میں سے تھے اور انہوں نے مجھے اپنی مرویات اور مؤلفات کی اجازت دی تھی۔ اور یہ اس معتمد سند کے مطابق ہے جو ایسے زمانے میں پائی جارہی ہے جو بے لطف و بے مزہ ہے اور جس میں جینا دوبھر ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ میں نے مشکاۃ کی بعض احادیث بحرِ عرفان کے منبع، مشہور عالم مولانا میرکلاں (۳۳) کے سامنے بھی پڑھی تھیں اور انہوں نے مشکاۃ شریف بہترین محقق، بے بدل نکتہ رس عالم میرک شاہ (۳۴) سے پڑھی، اور انہوں نے اپنے والد صاحب محدث مولانا

---

۳۳ : علامہ شریف عبدالحیٔ بن فخر الدین حسنی نے اپنی کتاب: "نُزهَةُ الخَواطِر و بهجة المَسامِع و النَّواظِر" (۴ : ۳۳۱) میں ان کے بارے میں یہ کہا ہے:

"موصوف مشہور شیخ، عالم، محدث محمد سعید بن مولانا خواجہ حنفی خراسانی تھے۔ آپ کی شہرت "میرکلاں" کے نام سے تھی۔ کبار علماء میں سے تھے۔ آپ کی ولادت، نشو ونما اور دینی وعلمی تربیت علمی ماحول میں ہوئی۔ آپ نے علامہ عصام الدین ابراہیم بن عرب شاہ اسفرائینی اور دوسرے علماء سے علم حاصل کیا۔ پھر سید نسیم الدین میرک شاہ بن جمال الدین حسنی ہروی سے حدیث کا علم حاصل کیا اور ایک عرصے تک بالالتزام انہی کی خدمت میں رہے۔ پھر حرمین شریفین کا سفر کیا۔ حج کیا، مدینہ منورہ کی زیارت کی، اور ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں ہی سکونت پذیر رہے۔ ان سے شیخ علی بن سلطان قاری ہروی (صاحب مِرقَاةُ المَفَاتِيح)، اور سید غضنفر بن جعفر حسنی نہروالی اور علماء کی ایک بڑی جماعت نے علم حاصل کیا۔

آپ کے علمی فوائد کی نقول سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بہت بڑے عالم اور محقق محدث تھے۔ علوم وفنون میں آپ کو خوب مہارت تھی، خصوصاً علمِ حدیث میں تو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ آپ تمام عمر طریقِ ظاہر اور اصلاح کی رعایت کے ساتھ پڑھاتے ہوئے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ آپ کی وفات ۹۸۱ھ کو، اسی سال کی عمر میں آگرہ میں ہوئی۔ یہ تمام تفصیل بدایونی نے ذکر کی ہے"۔

۳۴ : میرزا محمد باقر خوانساری اپنی کتاب "رَوْضَاتُ الجَنَّات" (۱ : ۴۵۰) میں، شیخ محدث جمال الدین کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آپ کے باہمت بیٹے (یعنی جمال الدین محدث) جو امیر نسیم الدین کے نام سے مشہور، اور میرک شاہ سے ملقب ہیں، علوم وفنون کی تکمیل، اور خصوصاً علمِ حدیث میں نادرِ روزگار، اور معاصرین میں یکتا تھے۔ آپ اپنے والدِ معظم کے مقبرے کے پاس (آگرہ میں) قائم شدہ درس گاہ میں اُن کے قائم مقام بنے۔ اور اس ادارے کے بانی کی شرائطِ وقف کے مطابق تدریس اور افادے میں مشغول رہے"۔

مؤرخ میر خالد نے اپنی کتاب "روضۃُ الصّفا" میں آپ کا سنِ وفات ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی اب تک مجھے مل سکا ہے۔

سید جمال الدین (۳۵) سے پڑھی، جن کی کتاب "روضة الأحباب" ہے۔ اور انہوں نے اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی سے

۳۵ : میرزا محمد باقر خوانساری نے اپنی کتاب "رَوْضَاتُ الجنّات في أحوالِ العُلَمَاءِ وَالسَّادَات" (۱ : ۴۴۹) میں آپ کے حالات ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''سید فاضل، سنی محدّث جمال الدین میرزا عطاء اللہ بن امیر فضل اللہ شیرازی، دشتکی، ملقّب بہ جمال حسینی، صاحب کتاب: "رَوْضَةُ الأحباب في سيرةِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب". صاحب "مَجَالِسُ المُؤمِنِيْن" نے آپ کے جلیل القدر چچا امیر اصیل الدین عبداللہ حسینی دشتکی شیرازی، (جنہوں نے "درج الدُّرَر في أحوالِ سيِّدِ البشرِ" اور "رِسَالَةُ مِزَارَاتِ هَرَات" جیسی کتب لکھی ہیں) کا ترجمہ لکھنے کے بعد آپ کے حالاتِ زندگی کا تذکرہ کیا ہے۔

موصوف (یعنی صاحب "مَجَالِسُ المُؤمِنِيْن") نے سیرت کی کتابوں سے نقل کیا ہے کہ: ان کی وفات ۱۷ ربیع الاول ۸۰۳ ھ کو ہوئی۔ مزید ان کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ:

ان کے خاندان کا یہ رفیع المنزلت سلسلہ، تقیہ کی انتہائی رعایت کرتے ہوئے، اہلِ سنت کی کتبِ احادیث کی تدریس میں مشغول چلا آتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کے اکابر میں سے کسی نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور دیکھا کہ: انہوں نے آپ ﷺ کو کتاب: "مشکاۃ" دکھلائی اور اس کی احادیث کی صحت اور ضعف کے بارے میں پوچھا۔ اس پر آپ ﷺ نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے کر ورقہ ورقہ پلٹنا شروع کیا۔ جہاں کہیں موضوع حدیث نظر پڑتی، وہاں انکار کے طور پر انگلی پھیر دیتے، جس سے وہ حدیث مٹ جاتی۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے اس مٹانے کا اثر ان کے حقیقی نسخہ پر بھی ظاہر ہوا، اور اس کا نشان اس زمانے تک بھی موجود رہا ہے، اور وہ بعینہ مرجع زائرین ہے۔ اب بھی لوگ طہارت، حمد وصلاۃ اور اس جیسے مزید آداب کی تکمیل کے بعد اس نسخے کی زیارت کرتے ہیں۔

اس خواب کی وجہ سے، جاری ہونے والے بابرکت سلسلے سے کٹ کر، علیحدہ اور گمراہ ہونے کے بعد، سب سے پہلے جس نے احادیث کا مطالعہ چھوڑ کر، نری حکمت اور نری کلامی ابحاث کا اشتغال شروع کر دیا، وہ امیر صدر الدین محمد حسینی دشتکی شیرازی ہے۔ اور یہی امیر غیاث الدین منصور کا باپ ہے، جیسا کہ ابھی ان کے حالات میں آئے گا، إن شاء الله.

جب کہ اس سلسلے کے باقی حضرات، اپنے اکابر کے ہاں پیش آنے والے اس واقعہ کے حالات وأخبار کے تذکرہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور پیش آمدہ حالات میں انہیں، اسی کے وسیلے سے آسودگی وخوش حالی حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ موصوف نے آپ کے فارسی میں ذکر کردہ حالاتِ زندگی کے ذیل میں اسی کے ہم معنیٰ بات کہی ہے۔

مذکورہ بالا شیخ امیر جمال الدین عطاء اللہ حقیقتاً "عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ" کا مصداق تھے، اور اُن لوگوں میں شمار ہوتے تھے جن کی شان میں تعظیم واکرام کے طور پر "اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ" وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کمال تنسیق کے ساتھ ساتھ احوال اخبار اور احادیث کی تحقیق کی خصوصی توفیق وتائید عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنی عمر نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال کے تتبع میں کھپا دی، حتیٰ کہ عالم بھر میں آپ کے پھیلے ہوئے منتشر اقوال زریں، اہلِ علم اصحاب کے لیے تحفہ، آپ کی سیرت وشمائل کی پھلواری اور آپ کی مطبوعات "رَوْضَةُ الأحبابِ" وغیرہ کی زینت ہیں۔ اور جیسا کہ صاحب سِیَر نے ذکر کیا ہے، آپ کے اقوال قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔

اور آپ اپنی قابلِ قدر کوششوں سے اپنے محترم چچا امیر سید اصیل الدین ہی کی طرح علمِ حدیث میں یکتا، اور علوم دینیہ کی تمام اقسام......

......اور فنونِ یقینیہ کی جمیع انواع میں ماہر تھے۔ آپ کا تدریس میں اشتغال اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ مدرسہ سلطانیہ کے اس قبہ میں بھی تھا جس میں خاقان منصور کا مقبرہ ہے، اور خانقاہ اخلاصیہ میں بھی تھا۔ ہر ہفتے میں ایک روز آپ شہر ہرات کی جامع اعظم جایا کرتے اور نجات کی طرف لے جانے والی ہدایت وارشاد پر وعظ فرماتے تھے۔ لیکن اب سابقہ معمول کے خلاف مخلوقِ خدا سے کنارہ کش ہو کر، گوشہ نشین ہیں، اور اخروی زندگی کی تیاری کے لیے اس کے شایانِ شان تیاری کی کوشش میں مشغول ہیں۔ اسی لیے تو دیکھے گا کہ آج کل کے سلاطین اور باقی سارے حکام اور بڑے عہدوں پر فائز لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے ملنے کی کوشش کرتے اور ان کی بابرکت صحبت مل جانے کو غنیمت خیال کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: موصوف کا یہ کہنا کہ: ''وہ تقیہ کی رعایت کرتے ہوئے ... اہلِ سنت کی کتب کی تدریس کرتے تھے''، جھوٹ اور نرا بہتان ہے۔ اس صاحبِ شرافت خاندان کے افراد کا شعار ہرگز تقیہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی آپ رافضی تھے۔ محقق سیرت نگاروں نے آپ کا اہلِ سنت والجماعت علماء میں تذکرہ کیا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

قاضی نور اللہ تستری (ت ۱۰۱۴ھ) غالی قسم کا رافضی تھا۔ اور یہی وہ پہلا رافضی ہے جس نے شیخ جمال محدث کو رافضی شیعہ میں شمار کیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ کے اَسلاف واَخلاف کو بھی روافض میں شمار کیا ہے۔ اور یہ تستری کی مشہور عادت ہے۔ خاص طور پر اہلِ سنت والجماعت کے علماءِ کبار کے ساتھ وہ یہی رویّہ اپناتا ہے۔ اور اس خباثت سے اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ابتری، بے چینی اور پھوٹ ڈال کر، ان کے معاملات کو بگاڑ کر مغالطات میں مبتلا کر دے۔ تستری کے بعد مزید شیعہ لوگوں نے اس کی نہج کو اپنایا اور اس کے قدم بہ قدم چلے، اور اُس کی کتاب ''مجالس المؤمنین'' سے اِن کے حالاتِ زندگی اپنی کتابوں میں درج کیے، اور انہیں رافضہ میں ذکر کر دیا۔

اہلِ سنت مؤرخین، جیسے فاضل غیاث الدین بن ہمام الدین ہروی (ت ۹۴۴ھ) وغیرہ نے ان کے حالات میں کوئی ایسی بات ذکر نہیں کی جس سے ان کے شیعہ یا رافضی ہونے کا سراغ لگ سکے۔ شیخ جمال محدّث کے تلامذہ میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے، جس نے ان کی جانب تشیُّع یا رِفض کی نسبت کی ہو۔ مستزاد یہ کہ متقن محدّثین نے آپ سے حدیث روایت کی ہے، اور آپ سے بہ حیثیتِ شیخ علم حاصل کرنے پر فخر کرتے تھے۔ ان سبھی لوگوں نے آپ کا تذکرہ صرف اچھائی سے کیا ہے، اور آپ کو ائمۂ اہلِ سنت والجماعت میں شمار کیا ہے۔

جہاں تک آپ کی کتاب "رَوْضَةُ الأَحبابِ في سِيَرِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب" کا تعلّق ہے، تو اس میں آپ کی وفات کے بعد کئی چیزیں داخل کر دی گئی ہیں۔ آپ نے یہ کتاب اپنے شیخ اور چچا سید اصیل الدین (ت ۸۸۳ھ - ۸۸۴ھ) کی زندگی میں تصنیف کی تھی، اور اس کے بعد آپ تقریباً اڑتالیس سال زندہ رہے۔ اور اس کتاب کو قبولِ عام حاصل ہوا اور متداول رہی۔ اس سب کے باوجود آپ کی کتاب میں کہیں بھی رفض نظر نہیں آتا۔ اگر آپ میں کہیں رفض موجود تھا تو آپ کی زندگی میں ظاہر ہو کر مشہور ہو جاتا۔ بہر حال! یہ اس بات کی انتہائی مضبوط دلیل ہے کہ مخدوم الملک کے ذکر کردہ اَشعار (جیسا کہ ان کا ذکر ابھی آئے گا) ان کی کتاب "رَوْضَةُ الأَحباب" میں شامل کیے گئے ہیں، اور یہ کوئی مقامِ تعجب نہیں ہے، کیونکہ رافضہ اس قسم کی حرکتوں میں معروف ہیں۔ ہندوستان کے متکلمین وفقہاء کے رئیس، علامہ شیخ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "التُّحفةُ الإثنا عشريّة" میں:

"وَمِن مَكَائِدِهِم: أنَّهم يَزيدُون بعضَ الأبياتِ في شِعْرِ أحَدِ أئمَّةِ أهلِ السُّنَّة، مِمَّا يُوذِنُ بتشيُّعِه، كما فعَلُوا في "دِيوَان حافِظِ الشِّيرَازيّ"، و "دِيوَان مَولانا الرُّومِيّ" و "الشَّيخ شَمسِ الدِّين تَبرِيزيّ" - قُدِّسَ سِرُّهُ -".

کہ: رافضہ اور شیعہ کے مکر وفریب کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ ائمہ اہل سنت کے اَشعار میں چند ایسے اشعار کی زیادتی کر دیتے ہیں جن سے ان......

......کا شیعہ ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسی حرکت دیوانِ حافظ شیرازی، دیوانِ مولانا رومی اور شیخ شمس الدین تبریزی قدس سرُہ کی کتب میں کی ہے'،

کہہ کر ان کی اس شنیع عادت کا تذکرہ کیا ہے۔

چونکہ آپ کی کتاب: "رَوْضَةُ الأَحباب في سيرةِ النَّبيِّ والآلِ والأصحاب" میں بعض خبیث شیعہ لوگوں کی طرف سے ایسے اَشعار کی زیادتی کر دی گئی تھی، اسی لیے مخدوم الملک نے اس کتاب کے سید جمال الدین محدّث کی تصنیفات میں سے ہونے کا انکار کیا ہے، اور اس پر اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ مؤرخ بدایونی نے مشہور فقیہ و محدّث شیخ عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری (ت ۹۰۰ھ، ۹۰۱ھ) جو مخدوم الملک کے نام سے مشہور ہیں، سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: وہ فرمایا کرتے تھے:

"رَوْضَةُ الأَحبابِ" امیر جمال الدین محدث کی تصنیفات میں سے نہیں ہے'۔ اور اس پر یہ دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ: انہوں نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں یہ شعر نقل کیا ہے:

ہمیں بس بود حق نمائیِ اُو   کہ کردند شک در خدائیِ تو

پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: دیکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیسا مبالغہ کیا ہے؟ حتی کہ رفض کے عقیدے سے تجاوز کرتے ہوئے حلول کے عقیدے تک جا پہنچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ میں نے عرض کیا: یہ تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے:

لو أنَّ المُرتضىٰ أبدٰا محله   لصار الناس طرا سجدا له

كفى في فضل مولانا علي   وُقوعُ الشَّكِّ فيه: أنَّه الله

اس پر انہوں نے غضب ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، اور میرے پیش کردہ شعر کی صحتِ نقل پر بحث کرنے لگے۔ میں نے کہا: یہ شعر میر حسین میبذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شعری دیوان کی شرح میں نقل کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میبذی بھی تو انہی میں سے ہے۔ تو میں نے عرض کیا: میں نے بعض قابلِ بھروسہ لوگوں سے سنا ہے کہ "رَوْضَةُ الأَحباب" کی تیسری جلد امیر جمال الدین محدث کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے بیٹے میرک شاہ کے قلم سے ہے۔ تو کہنے لگے: میں نے ایسی بعض ناپسندیدہ باتیں دوسری جلد میں بھی دیکھی ہیں، اسی لیے میں نے ان پر حاشیے لکھ دیے ہیں'۔ ان کا کلام پورا ہوا۔

یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ: مخدوم الملک کو اس بات کا یقین تھا کہ جمال الدین محدث اور ان کے بیٹے میرک شاہ، دونوں ہی اہل سنت میں سے ہیں۔

(سید اصیل الدین شیرازی کے نام کے ساتھ بھی اسی حاشیے کو پڑھا جائے)۔

میر خواند (ت ۹۰۳ھ) نے اپنی: "رَوْضَةُ الصَّفا فِي سِيرَةِ الأَنبِيَاءِ وَ المُلوك والخُلَفاء" (۷: ۷۲، طبع بمبئي ۱۲٦٦هج) نامی فارسی کتاب میں کہا ہے:

"امیر سید اصیل الدین عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن عبداللطیف بن جلال الدین یحییٰ حسینی۔ اپنی اصالت، جلالتِ علمی اور نباہت و ذکاوت کی وجہ سے ممتاز شخصیت کے مالک اور ہم عصر لوگوں پر فائق تھے۔ صحفِ الٰہیہ کے حقائق و اسرار کی تشریح، اور ان کے دقائق و معارف کی توضیح......

پڑھی۔ روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے تقریباً اکیاسی (۸۱) اکابر علماء کو پایا ہے، جن میں مولانا محمد (۳۶) بن محمد بن محمد جزری، قاموس

......کیا کرتے تھے۔ آپ کی زبان علم وحکمت کے موتی بکھیرا کرتی تھی۔ آپ علمِ تفسیر وجدل اور انشاء میں عدیم النظیر تھے۔ ملک خاقان سعید کے عہد حکومت میں آپ اپنی جائے پیدائش شیراز کو چھوڑ کر ہرات آ گئے، اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ ہفتے میں ایک دفعہ "مدرسہ مہد علی گوہر شاہ آغا" میں وعظ دیا کرتے، اور لوگوں کو رشد وہدایت کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ آپ ماہِ ربیع الاوّل میں رسول اللہ ﷺ کی سنن اور سیرت کا اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے لوگوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ آپ کی وفات ۱۷ ربیع الاوّل ۸۸۳ھ، یا ۸۸۴ھ کو ہوئی۔

آپ کی تالیفات میں سے "دَرْجُ الدُّرَرِ فِي مِيْلَادِ سَيِّدِ الْبَشَرِ" اور "حصنِ حصين" کی شرح ہے"۔

۳۶ : شیخ ابو الخیر طاش کبریٰ زادہ "الشَّقَائِقُ النُّعْمَانِيَّة" میں رقم طراز ہیں:

"شیخ محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف جزری۔ آپ کی کنیت ابو الخیر ہے۔ آپ کی ولادت کی جہاں تک آپ نے خود تحقیق کی ہے، آپ کے والد صاحب کے بقول: ہفتہ کی رات، ۲۵ رمضان المبارک ۷۵۱ھ کو دمشق میں ہوئی۔ آپ نے ۷۶۴ھ میں قرآن مجید حفظ مکمل کیا، اور ۷۶۵ھ میں تراویح میں سنایا۔ محدثین کی ایک جماعت سے حدیث سنی۔ اور بعض شیوخ سے باقاعدہ علمِ قراءت حاصل کیا۔ ۷۶۸ھ میں قراءتِ سبعہ کی تکمیل کی، اور اسی سال حج بھی کیا۔

اس کے بعد آپ دیارِ مصر تشریف لے گئے اور وہاں اصول، معانی اور بیان وغیرہ کی کتب پڑھیں۔ پھر اسکندریہ کا سفر کیا اور ابن عبد السلام وغیرہ کے تلامذہ سے حدیث سنی اور شیخ الاسلام ابو الفداء اسماعیل بن کثیر نے ۷۷۴ھ میں آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ شیخ ضیاء الدین نے ۷۷۸ھ میں، اور شیخ الاسلام بلقینی نے بھی ۷۸۵ھ میں آپ کو فتویٰ نویسی کی اجازت عطا فرمائی۔

اس کے بعد آپ نے پڑھانا شروع کیا۔ قراء کی ایک کثیر تعداد نے قراءات کا علم آپ سے حاصل کیا۔ آپ ۷۹۳ھ میں شام کے عہدۂ قضا پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد آپ روم چلے گئے، جس کی وجہ یہ بنی کہ ۷۹۸ھ میں، دیارِ مصر میں آپ اور آپ کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں کا مال ظلماً چھین لیا گیا۔ بہر حال، پھر آپ بروسا نامی شہر میں آ بسے جو ملکِ کامل مجاہد بایزید بن عثمان کا علاقہ تھا۔ وہیں پر اس اور بعض دوسرے علاقوں کے بہت سے لوگوں نے آپ سے قراءاتِ عشر کی تکمیل کی۔

پھر جب ۸۰۵ھ میں بہت عظیم اور مشہور فتنہ ظہور پذیر ہوا، تو تیمور خان آپ کو لے کر ماوراء النہر کی طرف نکل گیا، اور آپ کو پہلے "کش" نامی شہر میں، اور پھر سمرقند لے گیا۔ ان سب جگہوں پر بہت سے لوگوں نے آپ سے قراءت کے علم کو حاصل کیا۔ پھر جب امیر تیمور کی شعبان ۸۰۷ھ میں وفات ہو گئی تو آپ ماوراء النہر کے علاقے سے نکلے، خراسان پہنچے اور ہرات میں داخل ہوئے۔ پھر "یزد" نامی شہر میں گئے، وہاں سے اصبہان ہوتے ہوئے شیراز پہنچے۔ اور ہر شہر میں طلبہ کی ایک بڑی جماعت میں سے بعض نے آپ سے سبعہ، اور بعض نے عشرہ قراءات حاصل کیں۔

شیراز کے گورنر پیر محمد نے شیراز اور اس کے نواح کا عہدۂ قضا آپ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ آپ کافی عرصہ نہ چاہتے ہوئے بھی شیراز میں فروکش رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے کشادگی کی اور آپ وہاں سے بصرہ چلے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی سکونت کی توفیق بخشی۔ آپ کی مدینہ منورہ میں رہائش کے دوران شیخ حرم نے آپ کے پاس پڑھا اور آپ نے علمِ قراءت میں "النشر في القراءات العشر" دو جلدوں میں، پھر اس کا اختصار بنام "التَّقرِيب" علمِ قراءاتِ عشرہ میں، "تحبير التَّيسِير" اور "طبقات القُرَّاء" پھر ان کی تاریخ "کبریٰ" اور "صُغریٰ" لکھی"۔......

موصوف کے مزید حالات زندگی کے لیے دیکھیے :"الشقائق النُّعمانية"(۱: ۳۹ - ۴۰) اور "غاية النّهاية" (۲: ۲۴۸-۲۵۱).

والے شیخ مجد الدین (۳۷) فیروز آبادی، اور علامہ سید شریف (۳۸) جرجانی ہیں ۔ اور شیخ شیرازی سے مولانا نور الدین (۳۹) جامی قدس سرہ، (جنہوں نے ۸۸۴ھ میں وفات پائی) اور دوسرے علماء نے حدیث سنی ہے۔

...... میں نے آپ کے حالاتِ زندگی آپ کی اسی تاریخ صُغریٰ سے نقل کیے ہیں۔

جب امیر تیمور آپ کو اپنے ساتھ ماوراء النہر لے گیا تھا، تو آپ نے وہیں تین اسفار میں "مصابیح" کی شرح بھی لکھی تھی۔ آپ نے تفسیر، حدیث اور فقہ میں بھی لکھا۔ اور بہت پہلے "غاية المَهَرَة في الزّيادة على العَشَرَة" کو منظوم کیا۔

اس کے علاوہ "طيبة النشر في القراء ات العشر" اور "الجَوْهَرَةُ فِي النَّحْوِ" اور "المقدّمة فيما على قَارِئِ القُرآن أن يَعْلَمَه" کے علاوہ مزید کئی فنون کی دوسری کتب کو بھی منظوم کیا۔

امام جزری کے یہ حالاتِ زندگی موصوف نے اپنی کتاب "اَلطَّبَقَاتُ الصُّغریٰ" میں خود ذکر کیے ہیں، جنہیں میں نے (یعنی شیخ طاش کبریٰ زادہ نے) ان کے اپنے قلم سے تحریر کردہ عبارت سے نقل کیا ہے۔

میں نے امام جزری کی کتاب "الطّبقاتُ الصُّغریٰ" میں، ان کے اپنے قلم سے، اپنے ذکر کردہ حالاتِ زندگی کو یہاں نقل کیا ہے۔

آپ کے کسی شاگرد کی تحریر آپ کی وفات کے بارے میں یہ ہے:

علامہ جزری کے علمی سمندر سے چند گھونٹ پینے والا عرض پرداز ہے کہ: ہمارے شیخ رحمہ اللہ نے ۵ ربیع الاوّل ۸۳۳ھ کو، جمعہ کے روز بوقت دوپہر، شیراز میں وفات پائی، اور اسی دار القراء میں مدفون ہوئے جس کی بنیاد آپ ہی نے رکھی تھی۔ آپ کا جنازہ بھی یادگار تھا۔ کیا اشراف، کیا خواص، سبھی آپ کے جنازے کو اٹھانے، آپ کو بوسہ دینے اور تبرکاً چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور جو شخص خود یہ حاصل نہ کر سکا، وہ اس شخص کو تبرکاً چھو رہا تھا جس نے آپ کو چھو لیا تھا۔ آپ کی موت سے اسلام کی ایک بہت بڑی شخصیت کا نشان مٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سے، آپ کے اسلاف اور اخلاف سے راضی ہو۔

آپ کی تصنیفات میں سے ایک "اَلحِصْنُ الحَصِينُ" ہے، جو نبی اکرم ﷺ سے منقول شدہ ماثور دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ انتہائی نفیس کتاب ہے۔ موصوف نے پھر خود ہی اس کا غیر مخل اختصار بھی کیا تھا۔

۳۷ : طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب "الشّقائقُ النُّعمانية" میں کہا ہے:

مولوی فاضل، صاحبِ "اَلقَامُوس" مجدُ الدّین ابو طاہر محمد بن یعقوب بن محمد شیرازی فیروز آبادی۔ کبھی تو آپ اپنا نسب ابو اسحاق شیرازی، صاحب "التّنبيه" کی طرف کرتے تھے اور کبھی اپنا نسب نامہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تک بھی پہنچاتے تھے۔ اور اپنے خطِ صدیقی سے لکھا کرتے تھے۔ بلادِ روم میں گئے۔ سلطان کی خدمت میں جا پہنچے، اور اس کے ہاں جاہ و مرتبہ حاصل کر لیا۔ سلطان نے آپ کو بہت سا مال دیا۔ امیر تیمور نے بھی آپ کو پانچ ہزار دینار دیے تھے۔

بعد ازیں، آپ شرق و غرب کے بلاد میں پھرے اور وہاں کے علماء سے علم حاصل کیا، حتیٰ کہ آپ تمام علوم و فنون، خصوصاً حدیث، تفسیر اور لغت میں ماہر ہو گئے۔ آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں جو چالیس سے متجاوز ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے اہم ترین تصنیف یہ ہے: "اَللّامِعُ المُعلِمِ العُجَاب، الجَامِعِ بَيْنَ المُحْكَمِ وَالعُبَاب"، یہ کتاب ساٹھ جلدوں میں مکمل ہوئی تھی۔ پھر آپ نے اس کی تلخیص دو جلدوں میں......

.....کر کے اس کا نام "اَلْقَامُوْسُ الْمُحِیْط" رکھا۔ آپ کی تصنیفات میں ایک تفسیر، بخاری شریف کی شرح اور "اَلْمَشَارِق" ہے۔

آپ جس شہر میں بھی جاتے، شہر کا والی آپ کا اکرام کرتا۔ آپ بہت جلد حفظ یاد کر لیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے: "میں جب بھی سوتا ہوں، دو سوسطریں یاد کرنے کے بعد ہی سوتا ہوں"۔ آپ عجیب وغریب معارف کے کثیر الاطلاع عالم تھے۔ بالجملہ آپ حفظ، اطلاع اور تصنیف میں ایک نشانی تھے۔

آپ کی پیدائش ۷۲۹ھ کو، کازرین میں ہوئی۔ اور آپ کی وفات ۲۰ شوال ۸۱۶ھ، یا ۸۱۷ھ کو، بلادِ یمن میں اس وقت ہوئی جب کہ آپ زبید کے قاضی تھے۔ آخر تک آپ کے تمام قویٰ سلامت تھے۔ آپ کی تدفین شیخ اسماعیل جبرتی کی قبر کے پاس ہوئی۔

آپ آٹھویں صدی کے اخیر میں مرنے والے ان علماء میں سے آخری عالم تھے جن میں کا ہر ایک تمام فنون وعلوم میں اپنے تمام اقران سے فائق تھا۔ ان علماء کی فہرست میں شیخ سراج الدین بلقینیؒ مذہبِ امام شافعی میں، شیخ زین الدین عراقی حدیث میں، شیخ سراج الدین ابن المُلَقِّنؒ فقہ و حدیث پر کثرتِ تصانیف میں، شیخ شمس الدین فناری تمام عقلی ونقلی علوم اور عربیت میں، شیخ ابوعبداللہ بن عرفہ مالکی فقہ میں اور مغرب میں پڑھائے جانے والے باقی تمام علوم میں اور شیخ مجد الدین لغت میں فائق تھے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔ (۱ : ۳۲ - ۳٤)

مزید دیکھیے: "الضَّوءُ اللَّامِع" للسَّخاوي (۱۰ : ۷۹ - ۸۰)، "بُغيَةُ الوُعَاة" للسُّيوطي (ص ۱۱۷ - ۱۱۸)، "شذراتُ الذَّهَب" لابنِ العِمَاد (۷ : ۱۲٦-۱۳۱)، اور "مُقَدِّمَةُ تَاجِ العُرُوس"۔

۳۸ : قاضی محمد بن علی شوکانی (ت ۱۲۵۰ھ) "البَدرُ الطَّالِع، بِمَحَاسِنِ من بعد القَرنِ السَّابِع" (۲ : ٤۸۸ - ٤۹۰) میں رقم طراز ہیں:

سید علی بن محمد بن علی حسینی جرجانی۔ مشرق کے عالم تھے اور سید شریف کے نام سے جانے جاتے تھے۔ موصوف محمد بن زید داعی کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے اور ان کے درمیان تیرہ پشتیں ہیں۔ آپ کی ولادت ۷٤۰ھ کو ہوئی۔ اپنے ہی علاقے میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ "المفتاح" کی قراءت اس کے شارح کے سامنے کی۔ ایسے ہی قطب کی "شَرْحُ المِفْتَاح" کو، اس کے مؤلف کے بیٹے مخلص الدین بن ابی الخیر علی سے پڑھا۔ پھر مصر آ گئے اور وہاں اکمل الدین وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ "سَعِیْدُ السُّعَدَاء" نامی جگہ پر چار سال قیام کیا۔

پھر بلادِ روم گئے اور وہاں سے بلادِ عجم چلے گئے، اور تحصیلِ علم کے بعد جمیع علوم عقلیہ وغیرہ میں امام اور یکتا ہو گئے تھے۔ آپ نے جمیع انواع میں تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ علوم وفنون کے دقائق اور جلیل القدر مباحث کے متبحر عالم تھے۔

آپ کی شہرت آفاق میں پھیل گئی اور تمام بلاد کے لوگوں نے آپ کی تصنیفات سے نفع اٹھایا۔ ہر فن میں آپ کی کتب مشہور ہیں، اور اکابر علماء بھی ان سے احتجاج کرتے ہیں، اور ان کی عبارات کو نقل کرتے ہوئے، استفادہ کرتے ہیں۔

آپ کی تصنیفات میں سے مشہور "شَرْحُ المِفْتَاح"، "شَرْحُ المَوَاقِفِ العَضُدِيَّة"، علم ہیئت میں "شَرْحُ الجَغْمِيْنِي"، اور "شَرْحُ الفَرَائِضِ الحَنَفِيَّة" ہیں۔ آپ کی ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں ہیں۔

آپ درس وتدریس اور افتاء سے بھی منسلک رہے۔ آپ سے بہت سے اکابر نے علم حاصل کیا، اور آپ کی تعظیم وتکریم میں انتہائی مبالغہ کیا ہے۔ خصوصاً علماءِ عجم کا تو یہ حال تھا کہ انہوں نے شیخ جرجانی اور سعد الدین تفتازانی، دونوں کو ان حضرات کے علوم میں حجت قرار دیا ہے۔

ان دونوں حضرات کے درمیان تیمور لنگ کی مجلس میں مباحثات بھی ہوتے رہے ہیں۔ اور اسی وقت سے بعد تک کے زمانوں میں.....

.....لوگوں کا اختلاف رہا ہے کہ ان مباحثات میں حق پر کون تھا۔ اور علماء کے درمیان یہ اختلاف تمام زمانوں میں چلا آ رہا ہے۔ خصوصاً علماءِ روم میں تو ان ابحاث کا اس قدر چرچا تھا کہ: جہاں وہ اپنے اکابر علماء کے باقی اوصاف بیان کیا کرتے تھے، وہیں ان کا یہ موقف بھی بیان کیا کرتے تھے کہ: وہ سید شریف جرجانی کو ترجیح دینے کی جانب مائل تھے یا سعد تفتازانی کو ترجیح دینے کے قائل تھے اس لیے کہ انہیں ان کے اختلافات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ صاحبِ ترجمہ سید شریف جرجانی کے ہم عصر لوگ آپ سے علم حاصل کرنے کی سعادت کو قابلِ فخر سمجھتے تھے، اور آپ کے بعد آپ کے تلامذہ سے علم حاصل کرنے کو سعادت گردانتے تھے۔

آپ کی تصنیفات بہت نافع ہیں۔ بہت سی ابحاث کو سمیٹے ہوئے، واضح الفاظ کی حامل، بہت کم تکلف والی اور ایسی تعقید سے خالی ہیں جس میں عجمی زبان والے اکثر ملوث ہوتے ہیں اور بہت سے عجمی مصنفین کی تصنیفات میں ایسا ہے۔

آپ کی وفات ۶ ربیع الاوّل ۸۱۶ ھ کو، بدھ کے روز، شیراز میں ہوئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ۸۱۴ ھ کو آپ کی وفات ہوئی''۔

مزید دیکھیے: "الضَّوءُ اللَّامِع" لِلسَّخَاوِي (۵: ۳۲۸ - ۳۳۰)، اور "بُغْيَةُ الْوُعَاة" لِلسُّيُوطِي (۱: ۲۹۳).

۳۹ : طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب "الشَّقَائِقُ النُّعمَانِيَّة" میں کہا ہے:

''شیخ عارف باللہ عبدالرحمٰن بن احمد جامی۔ آپ کی ولادت خراسان کے جام نامی قصبہ میں ہوئی۔ پہلے تحصیلِ علم میں مشغول ہوئے، حتیٰ کہ اَفاضلِ عصر میں شمار ہونے لگا۔ پھر مشائخ صوفیہ کی صحبت اختیار کی۔ کلمۂ توحید کی تلقین عارف باللہ شیخ سعدالدین کاشغری سے حاصل کی، اس کے بعد خواجہ عبیداللہ سمرقندی کی صحبت اختیار کی اور انہی کی طرف مکمل طور پر منسوب ہو گئے۔ آپ نے اپنی کئی کتب میں خواجہ عبیداللہ رحمہ اللہ کے اوصاف ،اور ان کے ساتھ اپنی محبت کا ذکر کیا ہے۔

آپ کا علم وفضل شہرہ آفاق تھا۔ حتیٰ کہ سلطان بایزید خان نے آپ کو اپنی قلمرو میں بلوایا۔ آپ کے لیے قیمتی تحائف بھجوائے۔ جس شخص نے ان تحائف کو آپ تک پہنچایا تھا، اس کا بیان ہے کہ:

آپ نے سفر کا سامان تیار کیا اور خراسان سے بلادِ روم کی جانب سفر شروع کر دیا۔ جب آپ ہمذان تک پہنچے، تو تحائف پہنچانے والے سے کہا: میں نے ان کے حکم کو پورا کر دیا، یہاں تک کہ ہمذان تک آ پہنچا ہوں۔ اس کے بعد میں معذرت چاہوں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ میرا عذر قبول کر لیں گے کہ میں بلادِ روم میں داخل نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ میں نے سنا ہے وہاں مرضِ طاعون پھیلا ہوا ہے۔

مولیٰ اعظم سیدی محی الدین فناری اپنے والد مولیٰ علی فناری سے حکایت نقل کرتے ہیں کہ:

ان کے والد صاحب، جو کہ سلطان محمد خان کے لشکر کے قاضی تھے، نے کہا کہ: ایک دن سلطان نے مجھ سے کہا کہ: حقیقت کی معرفت کے بارے میں بحث وغور کرنے والے صرف متکلمین، صوفیہ اور حکماء ہیں۔ لہٰذا، ان شعبے والوں کے مابین محاکمہ کروانا چاہیے۔ کہتے ہیں: میرے والد صاحب نے کہا: میں نے سلطان محمد خان سے کہا: ان سب کے درمیان محاکمہ صرف مولیٰ عبدالرحمٰن جامی ہی کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں: اس پر سلطان محمد خان نے ان کی طرف مختلف تحائف بھجوائے، اور ان سے مذکورہ بالا محاکمہ کی التماس کی۔ چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن جامی نے ایک رسالہ لکھا جس میں ان طائفوں کے مابین چھ مسائل کے بارے میں محاکمہ کیا۔ ان میں سے ایک مسئلہ وجود کا بھی تھا، اور یہ رسالہ سلطان محمد خان کو بھجوا دیا، اور کہا: اگر یہ رسالہ قبول کر لیا گیا تو باقی مسائل کی ابحاث کو بھی روانہ کر دیا جائے گا، ورنہ وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور انہوں نے کہا: میں نے یہ کتاب "مشکاۃ المصابیح" مولانا شرف الدین (۴۰) جرہی سے روایت کی ہے اور وہ اسے امام

...... چنانچہ یہ رسالہ بھیج دیا گیا، مگر یہ رسالہ سلطان محمد خان کی وفات کے بعد روم پہنچا۔ مولیٰ محیی الدین فناری کہتے ہیں: یہ رسالہ میرے والد صاحب کے پاس محفوظ تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہا تھا: وہ اب میرے پاس ہے۔

آپ نے فارسی میں نظم بھی کہی ہے، جسے علماء نے بعض سلف کی نظم پر بھی ترجیح دی ہے۔ فارسی زبان میں آپ کے بعض تخلیقی مضامین بھی ہیں، جو اہلِ انشاء کے درمیان غایتِ حسن وقبول کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی مزید منظوم ومنثور تصنیفات بھی ہیں، جن میں سے ایک کافیہ کی شرح بھی ہے۔ آپ نے اس میں کافیہ کی باقی شروح میں موجود فوائد ونکات کو بہت ہی خوبصورت طریقے سے، اپنی جانب سے زیادات کے ساتھ ملخصاً جمع کر دیا ہے۔

آپ نے قرآن مجید کے اوائل پر تفسیری رنگ میں لکھا، جس میں بعض کو تو بطونِ قرآن مجید ہی سے اخذ کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی ایک فارسی کتاب "شواهد النُّبوّة" ہے۔ علاوہ ازیں "نفحات الأنس" بھی فارسی ہی میں ہے۔ مزید برآں "سلسلة الذَّهب" بھی آپ ہی کے قلم سے ہے۔ آپ نے اس میں رافضیوں کے مختلف فرقوں پر اعتراضات کیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی ان کتب کے علاوہ بھی کئی تصنیفات ہیں جیسے "رسالة المعمّىٰ والعروض والقافية"۔ آپ کی تمام کتب علماء وفضلاء کے ہاں مقبول ہیں۔

آپ کی وفات ۸۹۸ھ کو ہرات میں ہوئی۔ مؤرخ نے آپ کی تاریخِ وفات کے بارے میں کہا ہے: "وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِناً"۔

کہا گیا ہے کہ: جب اردبیلی سرکش ٹولے نے خراسان کا رخ کیا، تو آپ کے بیٹے نے آپ کی قبر سے میت کو نکال کر کسی دوسری جگہ (دوسرے شہر لے جا کر) دفن کر دیا۔ پھر جب مذکورہ بالا ٹولے کا تسلط قائم ہو گیا تو انہوں نے آپ کی قبر مبارک کو کھود ڈالا، مگر انہیں اس میں سے کچھ بھی نہ ملا۔ چنانچہ انہوں نے اس میں موجود لکڑیوں کو ہی جلا ڈالا۔

مزید دیکھیں: "شذرات الذَّهب" لابن العماد (۷: ۳۶۰) اور "روضات الجنات" للخوانساري (۱: ۴۳۷ - ۴۳۸)۔

۴۰: حافظ سخاوی نے اپنی کتاب: "الضوء اللامع" (۴: ۱۸۱ - ۱۸۲) میں کہا ہے:

شیخ عبدالرحیم بن عبدالکریم بن نصر اللہ ... جمال الدین قرشی، بکری، صدیقی، جرہی الاصل، اور شیرازی المولد، مسلکاً شافعی تھے۔ (جرہ: جیم کے کسرہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے)۔

جوہرینی نے کہا ہے:

آپ کی ولادت جمعرات کی رات، ۳ صفر ۷۴۴ھ کو، شیراز میں ہوئی۔ آپ نے صرف چھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ آپ نے روایت ودرایت کو اپنے والد صاحب سے اخذ کیا، اور فقہی تربیت اپنے مددگار بھائی ابو محمد عبداللہ اور ان کے استاذ فخر احمد بن محمد سمرقندی ... اور عبداللہ بن محمود بن نجیم شیرازی سے حاصل کی۔ قاضی عضد سے کشاف کو سنا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ قوام اور معمر امام الدین حمزہ بن محمد تبریزی، سعد الدین محمد بن مسعود بلیانی، فرید الدین عبدالودود بن داود شیرازی، اور مجد اسماعیل الفالی شیرازی سے حدیث سنی۔

اور ان صفِ اوّل کے محدثین میں سے آخری ابو الفتوح طاؤسی سے بھی آپ نے استفادہ کیا۔ بلکہ ان کے ساتھ تو حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔ امام الدین علی بن مبارک شاہ صدیقی ساوی سے بہت پہلے ۷۵۰ھ میں صحاح وغیرہ کا سماع کیا تھا۔ پھر آپ نے علمی سفر کیا اور مکہ مکرمہ میں عفیفین سے روایت کیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: آپ کی ان سے روایتِ حدیث اجازۃً ہے۔ مزید برآں آپ نے مجد فیروز آبادی سے ......

ملّت و دین خواجہ علی (۴۱) بن مبارک شاہ صدیقی سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ اسے مؤلف سے (۴۲) روایت کرتے ہیں۔ اور یہ ایسی سند ہے کہ اعتماد کے لیے اس سے اعلیٰ سند نہیں مل سکتی۔

......اور صاحبِ شرف ابوروح عیسیٰ عجلونی سے علم حاصل کیا۔ اور شیخ عجلونی سے تو وہ خرقہ بھی پہنا جو انہوں نے شمس محمد خابوری سے حاصل کیا تھا۔ سہروردی نے کہا ہے کہ:

آپ کے شیوخ میں سے غازی بن عبداللہ مزی بھی ہیں، جو فخر بن بخاری کے تلامذہ میں سے ایک ہیں۔ اور اصبہان میں جن شیوخ نے آپ کو اجازت دی، ان میں ابوالفتوح محمد بن محمد الالیسی بھی ہیں۔ وہ مسموع اور شیوخ، ہر دو کے اعتبار سے اپنی بستی والوں سے کہیں زیادہ مکثر ہیں۔ حتی کہ انہوں نے صحیح بخاری کو ستر سے زائد شیوخ کے ہاں سنا، ...اور صحیح مسلم کو دس سے زیادہ شیوخ سے سنا۔ آپ نے کتبِ ستہ، موطأ، مسند شافعی، سنن دارمی اور ان کے علاوہ دیگر کتب کا سماع مکمل کیا۔ میں نے اس کی کچھ تفصیل تاریخ مدینہ میں ذکر کی ہے۔

آپ نے حرمین میں بہت کثرت سے مجاورت وسکونت اختیار فرمائی، حتیٰ کہ آپ نے تیس سے زیادہ مرتبہ حج کیا اور حرمین اور بلادِ فارس میں بہت کثرت سے حدیث بیان کی، حتیٰ کہ اپنی مرض الموت میں بھی حدیث بیان کرتے رہے۔ آپ سے بہت سے ائمہ نے حدیث کا سماع کیا۔ انہیں میں سے ایک عفیف کے بیٹے محمد بھی ہیں، انہوں نے آپ سے بہت کچھ پڑھا اور آپ کا ذکر اپنے "مَشْیَخَة" میں کیا ہے، چنانچہ آپ کی انتہائی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آپ بہت بڑے عالم، شیخِ کبیر اور مسائلِ حج کے ماہر تھے۔ آپ نے تقریباً پچاس حج کیے۔ اکثر حرمین میں سکونت پذیر رہے۔ آپ کئی سال حدیث سنتے اور سناتے رہے۔ خود کہتے ہیں: "میں نے شیراز، عراق، مصر، شام اور حجاز میں تین سو مشائخ سے سماعاً، قراءۃً اور اجازۃً حدیث حاصل کی ہے"۔ کہتے ہیں: آپ کی شہرت اتنی زیادہ ہے کہ آپ کے بارے میں کوئی تفصیلی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جنہوں نے آپ سے حدیث سنی ان میں تقی ابن فہد اور ان کے دونوں بیٹے بھی ہیں۔ آپ سے ابوالفرج مراغی نے ۸۲۱ھ میں، روضۂ نبوی کے پاس "المصابیح" پڑھی اور آپ سے حدیث کی یہ کتاب سنی۔

آپ بہت زیادہ عبادت اور تلاوت فرماتے۔ بڑھاپے کے باوجود بھی اہتمام سے روزے رکھتے تھے۔ پانچوں نمازیں پابندی سے جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے عادی تھے۔ آپ کی وفات ہفتے کی رات ۲۷ صفر ۸۲۸ھ کو "لار" نامی قصبے میں ہوئی"۔

۴۱ : حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "الدُّرَرُ الكَامِنَةَ فِي أعيَانِ المِئَةِ الثَّامِنَةِ" (۲: ۸۵، مطبوعه حیدر آباد، دکن، هند، ۱۳۷۳ھ) میں علی بن مبارک شاہ ساوی کے حالات نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

"علی بن مبارک شاہ بن ابوبکر ساوی شیرازی۔ آپ کا لقب امام الدین تھا۔ آپ کی ولادت ۷۰۹ھ کو ہوئی۔ آپ نے حافظ مزی وغیرہ سے حدیث سنی۔ ابنِ جزری نے "مَشْيَخَةُ الجُنَيْد البَلْيَانِي" میں کہا ہے: "آپ علوم وفنون کے امام اور علامہ تھے۔ آپ نے علم وعمل کو جمع کیا۔ دمشق، مصر اور قدس وغیرہ میں آپ نے حدیث سنی، اور بہت زیادہ علم حاصل کر کے شیراز کی جانب لوٹے"۔ موصوف نے آپ کی تاریخِ وفات ذکر نہیں کی۔

۴۲ : یعنی ولی الدین، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ خطیب عمری تبریزی، جو آٹھویں صدی ہجری کے رجال میں سے ہیں۔ موصوف باعمل متقن محدثین اور اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں سے تھے۔ آپ نے مشہور فقیہ ومحدث، مفسر، متکلم، علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی (جن کا......

.....ذکر ابھی آتا ہے) سے علم حاصل کیا۔ عرصہ تک ان کے پاس رہے، اور علوم وفنون میں کمال حاصل کیا۔ ہمارے سامنے جو کتب تراجم ہیں، ہمیں ان میں آپ کے حالاتِ زندگی نہیں ملے۔ بس اتنا ہی ملتا ہے کہ آپ "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْح" کے شارحین میں سے ایک ہیں، اس کے علاوہ ایک دو جملے مزید حالات پر ہیں۔ آپ کے شیخ امام، عالمِ ربانی، احکام ومعانی کے جاننے والے، مشکاۃ کی سب سے پہلے شرح کرنے والے حسین بن محمد طیبی، آپ کا ذکر کرتے ہوئے، رقم طراز ہیں:

''دلوں کی تمنا، صلحاء کے قطب، زہاد وعباد کے لیے باعثِ شرف ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب''۔

آپ کے بارے میں حافظ ابن حجر ہیثمی مکی شافعی نے اپنی کتاب "فَتْحُ الإِلٰهِ فِي شَرْحِ الْمِشْكَاةِ" میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''علامہ، محقق، ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی شافعی''۔

ملا علی قاری نے آپ کے بارے میں کہا ہے:

''مولانا، حبر، علامہ، کثیر العلم، فہامہ، حقائق کے مظہر، باریکیوں کی وضاحت کرنے والے، شیخ تقی نقی ...''

مزید محدث فقیہ شیخ عبدالحق دہلوی نے اپنی شرح "لمعاتُ التَّنقيح في شرح مشكاة المصابيح" میں کہتے ہیں:

''یہ کتاب شیخ باعمل عالم، راہِ تصوف کے راہرو، تارکِ دنیا، دنیا سے بچنے والے، ماہر، فاضل کامل ولی الدین عبداللہ بن محمد بن عبداللہ خطیب عمری تبریزی کے قلم سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور، اور جنت کو ان کا ٹھکانا بنائے''۔

ہمارے پاس آپ کی تصنیفات میں سے "مشكاةُ المصابيح" اور "الإكمَال فِي أسمَاءِ الرِّجَال" ہی پہنچی ہیں۔ جب علامہ طیبی نے کشاف کا حاشیہ "فُتُوحُ الغَيْبِ فِي الكَشْفِ عَنْ قِنَاعِ الرَّيْبِ" لکھنا شروع کیا، وُجوہِ قراءات کی تبیین، احادیث و روایات کی تصحیح، اس کی لغات کی تحقیق اور اس کے نکات کی باریکیوں کو بیان کرنا شروع کیا، تو آپ کے دل میں یہ بات جم گئی کہ رسول اکرم ﷺ کے کلام کو جمع کریں، اور پھر اس کی شرح کریں، جیسا کہ کلام اللہ کی شرح بیان کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ اپنے شاگرد خطیب تبریزی کے سامنے کرتے ہوئے ان سے مشورہ کیا۔ اور ان دونوں شیوخ کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ امام بغوی رحمہ اللہ کی "مصابيحُ السُّنَّة" کی تہذیب اور استدراک کا کام کیا جائے، اس لیے کہ جمع وترتیب کے اعتبار سے یہ کتاب بہت بہترین ہے، اور انہوں نے احکام کے دلائل کو فقہاء کی پسندیدہ ترتیب کے موافق درج کیا، اور مقتضائے علم کے موافق ترغیب وترہیب کی احادیث کو نقل کیا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی باب کو اس کی جگہ سے ہٹا دے، تو غور وفکر کے بعد اسے سابقہ جگہ سے زیادہ کوئی دوسری موزوں جگہ نہ مل سکے گی۔ بہر حال، خطیب تبریزی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، اور اس کی تکمیل کے لیے کمر ہمت باندھی۔ اور مقدور بھر وسعت وطاقت اور احتیاط کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ اگر کہیں خلل تھا تو اس کی اصلاح کی، متفرق چیزوں کو اکٹھا کرتے ہوئے ان پر استدراک کیا۔ اور اسے حسن کی انتہا تک پہنچا دیا اور اس کا نام "مشكاةُ المصابيح" رکھا۔ آپ اس کی تالیف اور جمع وترتیب سے ۷۳۷ھ کو، رمضان المبارک کے آخری جمعہ کے دن، شوال کا چاند نظر آنے کے ساتھ فارغ ہوئے، اور عید کے تحفے کے طور پر اپنے شیخ کی خدمت میں پیش کیا، تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا، اور علامہ طیبی نے خود اس کی بہت نفیس شرح لکھی۔

بعد ازیں، خطیب تبریزی نے اس کتاب کو پڑھانا شروع کیا، اور افادہ واستفادہ کا سلسلہ جاری ہوا، تو آپ کے شاگرد علی بن مبارک شاہ صدیقی نے اس کتاب کو آپ سے روایت کیا۔ روایتی اعتبار سے اس کتاب کی متصل سند جو مؤلفِ کتاب تک پہنچتی ہے، وہ یہی واحد سند ہے، جو تمام اقطارِ اسلامیہ میں مشہور اور عام ہے۔......

......اس کے بعد خطیب تبریزی نے ایک کتاب "مِشكَاةُ المصابيح" کے رجال کے بارے میں لکھ کر، اس کا نام "الإِكْمَال فِي أَسْمَاءِ الرِّجَال" رکھا۔ یہ کتاب دو بابوں پر مشتمل ہے۔ موصوف اس کی ترتیب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

پہلا باب: مرد صحابہ کرام اور مستورات صحابیات رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ ساتھ، ان تابعین وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے یا "مِشكَاةُ المَصَابِيح" میں ان کی روایت موجود ہے۔ اسماء کی ترتیب حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔ میں نے کنیت سے مشہور رجال کا ذکر حروفِ کنیت میں کیا ہے، اور اسماء میں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ جیسے ابو ہریرہ، کہ آپ کا نام عبداللہ، یا عبدالرحمٰن ہے۔ اسے حرف "ھا" میں ذکر کیا ہے، حرف عین میں نہیں کیا۔

دوسرا باب: ان لوگوں کے تذکروں پر مشتمل ہے جو (نسب کے اعتبار سے) مشکاۃ کے بابِ اوّل میں مذکور شدہ لوگوں کے اصول میں سے ہیں، اگرچہ ہم نے ان کا تذکرہ بابِ اوّل میں نہیں کیا۔

پھر آخر میں کہا ہے:

''میں اس کتاب کی تصنیف، جمع وتہذیب اور کانٹ چھانٹ سے جمعہ کے دن، ۲۰ رجب الفرد، ۷۴۰ھ کو فارغ ہوا ہوں۔ (اس کے بعد مؤلف کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملتی۔ اور گمان ہے کہ آپ کی وفات اس کے بعد ہوئی۔

اسماعیل پاشا نے اپنی کتاب "هدية العارفين" (۲: ۱۵٦، طبع استنبول ۱۹۵۵م) میں بڑے جزم سے یہ بات کہی ہے کہ آپ کی وفات ۷۴۹ھ کو ہوئی ہے۔ لیکن ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ موصوف کے حالاتِ زندگی ذکر کرنے والوں نے یہ بات کہیں ذکر نہیں کی)۔ اور میں اللہ کے بندوں میں سے ایک کمزور، اللہ تعالیٰ سے عفو ومغفرت کا خواستگار بندہ محمد بن عبداللہ الخطیب بن محمد ہوں۔ اور اس کتاب کی تالیف میں مجھے اپنے شیخ اور مولانا، مفسرین کے سلطان، محققین کے امام، ملت ودین کی شرافت کے علم بردار، مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت: حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی کی معاونت حاصل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی لمبی عمر سے ہمیں نفع پہنچائے۔ تالیف سے فراغت کے بعد میں نے کتاب ان کے سامنے پیش کی، جیسا کہ میں نے مشکاۃ المصابیح کو بھی پیش کیا تھا، تو آپ نے اسے بھی بہت پسند کیا، جیسا کہ آپ نے مشکاۃ شریف کو پسند فرمایا تھا۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ اور حضرت محمد ﷺ اور آپ کی آل واصحاب پر اللہ کی طرف سے رحمتِ کاملہ اور سلامتی نازل ہو۔

آپ کی یہ کتاب "الإکمال" مختصر، مگر بہت مفید ہے۔ بعض اسماء کا ذکر آپ سے رہ گیا ہے، جن پر ملا علی قاری نے اپنی شرح میں تنبیہ بھی کی ہے۔ ہندوستان میں "الإکمال" کئی مرتبہ "مشكاة" کے ساتھ ہی چھپ چکی ہے۔

موصوف کی یہ تالیف اس بات کی بڑی واضح دلیل ہے کہ آپ صناعتِ حدیث، وسعتِ علمی اور وفورِ فضل کے ساتھ ساتھ حسن نیت کے ساتھ متصف تھے۔

موصوف کی کتاب "مشكاة المصابيح" کا بخطِ مؤلف نسخہ ۹۵۵ھ تک موجود رہا، پھر تلف ہو گیا۔

مشہور مؤرخ عبداللہ محمد بن عمر الشہیر بالحاج دبیر آصفی الغ خانی مکی نے اپنی کتاب "ظفر الواله بمظفر وآله" (۲: ۲۸۸ - ۲۸۹، لندن ۱۹۱۰م) میں، جہاں اپنے مربی عبدالعزیز آصف خان (ت ۹٦۱ھ) کا تذکرہ کیا ہے، وہاں رقم طراز ہیں:

''میرے ولی نعمت، میری تربیت کرنے والے اور مسند عالی کی برکت کا سبب شیخ عبدالعزیز آصف خان (کہ جن کے گن گانے ......

ملا علی قاری نے مشہور شیخ عالم کبیر عبداللہ ہندی سے بھی استفادہ کیا ہے، جو کہ مخدوم الملک (۴۳) سلطان پوری کے نام سے مشہور تھے۔ چنانچہ "تَحقِیقُ أحوَالِ المَهدِي" نامی اپنے رسالہ میں کہتے ہیں:

......اور فضل واحسان کے شکرانے، بلکہ اظہار فخر کے طور پر میں نے اپنے نام کے ساتھ آصفی کی نسبت شامل کر لی ہے) ۹۵۵ھ میں گجرات پہنچے۔

آپ کے مکہ مکرمہ سے گجرات آنے کا سبب یہ تھا کہ سلطان نے آپ کو بلایا تھا... چنانچہ آپ نے (آصف خان) نے ہندوستان کا سفر کیا۔ سمندر طغیانی پر تھا، جس کی وجہ سے آپ کا جہاز بنگلور کی بندرگاہ پر جالگا... جب آپ نے سلامتی کے ساتھ اپنا قدم ساحل سمندر پر رکھا تو سجدۂ شکر ادا کیا۔ اگر سمندر کچھ پرسکون ہو جاتا تو وہ مال اسباب بھی بچ جاتا، جو بچ نہ سکا۔ آصف خان کو اپنے اسباب میں سے صرف کتابوں کے ضائع ہونے کا صدمہ تھا۔ اس کے علاوہ لوہے کی ڈھالی ہوئی اس تلوار کا بھی افسوس تھا جو مکہ کے گورنر سلطان حجاز ابو یمنی محمد بن برکات کے جملہ ذخائر کا حصہ رہی تھی، اور اس نے شیخ آصف کو ترجیح دیتے ہوئے آپس کی محبت واخلاص کے اظہار کے لیے ان کے حوالے کی تھی۔

مزید برآں اس گھوڑے کے ضائع ہونے کا بھی آپ کو افسوس تھا جو مذکورہ بالا ذخیرہ ہی کا حصہ تھا اور اعلیٰ عربی اور تیز رفتار گھوڑوں کی نسل سے تھا، اور اس کا سوار، عربوں کی عادت کے موافق مقابلے کی دوڑ میں حصہ لے کر گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اور کتب کے ضائع ہونے پر جو افسوس تھا، وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر "مشكاة المصابيح" کے جامع ولی الدین خطیب تبریزی (اللہ ان کی جمع وترتیب کی کوششوں کو بار آور کرے) کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کے ضائع ہونے کا افسوس تھا۔

۴۳: سید عبدالحیٔ حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٤: ٢٠٦) میں کہا ہے:

شیخ، عالم کبیر عبداللہ بن شمس الدین انصاری سلطان پوری، جن کی شہرت مخدوم الملک کے لقب سے تھی۔ آپ اصلاً ٹھٹھہ کے رہنے والے تھے، جو سندھ کا علاقہ ہے۔ آپ کے دادا جان ٹھٹھہ سے جالندھر منتقل ہو گئے تھے۔ عبداللہ کی پیدائش سلطان پور میں ہوئی، جو پنجاب کا علاقہ ہے۔ بچپن ہی سے علم حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔ آپ نے سرہند کا سفر کیا، اور درسی کتب علامہ عبداللہ سرہندی کے پاس پڑھیں۔ پھر آپ دہلی گئے اور شیخ ابراہیم بن معین حسینی ایرجی سے حدیث حاصل کی۔ پھر اپنے علاقے میں واپس آ کر تدریس وتصنیف اور وعظ وتذکیر میں مشغول ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبولیت عامہ بخشی، چنانچہ ہمایوں شاہ تیموری نے شیخ الاسلام کا منصب آپ کے سپرد کیا، اور آپ اس کے اور اس کے بعد اس کے بیٹے اکبر شاہ کے عہد کے ابتدائی ایام میں اس عہدے پر فائز رہے۔ تمام ملوک وسلاطین آپ کا انتہائی اکرام کرتے تھے، اور آپ کے اشارے بھی قبول کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شیر شاہ نے آپ کو "صَدرُ الإِسلَام" کا لقب دیا تھا، اور اس کا بیٹا سلیم شاہ آپ کو اپنے تخت پر بٹھایا کرتا تھا، اور آپ کے سامنے بہت قیمتی نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ اور جب ہمایوں شاہ ایران سے واپس لوٹا اور دوبارہ بادشاہت کی کرسی پر بیٹھا، تو آپ کو "شَيخُ الإِسلَام" کا لقب دیا۔ اکبر شاہ نے آپ کو "مَخدُومُ المَلِكِ" کا لقب دیا۔ اور آپ کا وظیفہ ایک لاکھ درہم مقرر کیا۔

یہ معاملہ کئی سال تک یونہی چلتا رہا۔ پھر جب شیخ مبارک بن خضر ناگوری نے اکبر شاہ کے دل میں یہ فاسد عقیدہ گھسا دیا کہ وہ مجتہد فی المذہب ہے، اور اسے علماء وقضاۃ کی تقلید اور رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے، تو اس نے آپ کو حرمین شریفین کی طرف نکال دینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ آپ نے ۹۸۷ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا۔ جب آپ مکہ مبارکہ پہنچے تو مکہ کے اکابر علماء نے آپ کا استقبال کیا، شیخ شہاب الدین احمد ابن حجر مکی نے بڑی تعظیم اور ادب کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اس کے بعد آپ ایک مدت تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، پھر آپ واپس ہندوستان گئے۔......

میں نے علامہ فہامہ شیخ عبداللہ ہندی جو کہ خاص و عام میں مخدوم الملک کے نام مشہور ہیں، سے سنا...''۔ (۴۴)

آں موصوف نے طریقہء علیہ نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ وغیرہ کو اپنے زمانے کے مشائخ سے حاصل کیا۔ ایک عرصہ تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کی خدمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اسی لیے یہ سارے انوارات اور برکات حاصل کیں۔ ملا علی قاری کی ولایت زبان زد خاص و عام تھی۔ اور لوگوں میں ان کی فضیلت کی شہرت تھی۔ چنانچہ شیخ مستقیم زادہ سلیمان سعدالدین آفندی (ت ۱۲۰۲

......جب آپ گجرات پہنچے تو زہر سے آپ کی وفات ہوگئی۔

بدایونی نے کہا ہے کہ: آپ بہت مضبوط عالم تھے۔ فقہ واصول، تاریخ وحدیث اور باقی تمام علوم نقلیہ میں ماہر اور یکتا تھے۔ اہلِ بدعت اور نفسانی لوگوں خصوصاً شیعہ (رافضہ) کے ساتھ آپ کا معاملہ بہت متعصبانہ تھا۔ کہتے ہیں: آپ فرمایا کرتے تھے کہ: ''رَوْضَةُ الأَحْبَاب'' شیخ امیر جمال الدین محدث کی تصنیف نہیں ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ اشعار پیش کیا کرتے تھے جو اس کتاب کی تیسری جلد میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں نقل کیے گئے ہیں۔ شعر یہ ہیں:

ہمیں بس بود حق نمائی او   کہ کردند شک در خدائی تو

کہتے ہیں: یہ فرمانے کے بعد آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا: دیکھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کیسا مبالغہ کیا ہے؟ حتی کہ رفض کے عقیدے سے تجاوز کرتے ہوئے حلول کے عقیدے تک جا پہنچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے بچائے۔ میں نے عرض کیا: یہ تو حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے اس قول سے ماخوذ ہے:

لو أنّ المُرتضیٰ أبدٰا محله   لصار الناس طرا سُجّدًا له

کفی في فضل مولانا علي   وُقوعُ الشّكّ فیه: أنّه اللّٰه

اس پر انہوں نے غضب ناک آنکھوں سے مجھے دیکھا، اور میرے پیش کردہ شعر کی صحتِ نقل پر بحث کرنے لگے۔ میں نے کہا: یہ شعر میر حسین میبذی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شعری دیوان کی شرح میں نقل کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: میبذی بھی تو انہی میں سے ہے۔ تو میں نے عرض کیا: میں نے بعض قابلِ بھروسہ لوگوں سے سنا ہے کہ ''رَوْضَةُ الأَحباب'' کی تیسری جلد امیر جمال الدین محدث کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ ان کے بیٹے میرک شاہ کے قلم سے ہے۔ تو کہنے لگے: میں نے ایسی بعض ناپسندیدہ باتیں دوسری جلد میں بھی دیکھی ہیں، اسی لیے میں نے ان پر حاشیے لکھ دیے ہیں۔ ان کا کلام پورا ہوا۔

شیخ عبداللہ کی کئی تصنیفات ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: ''کشفُ الغُمّة'' ''منهاجُ العَابِدِین''، ''عصمة الأنبیاء''، ''شرح الحافظیة'' اور ''رِسالةٌ فِي تَفضِیْلِ العَقْلِ عَلیٰ العلم''. ان کے سوا بھی آپ کے کئی ایک رسائل ہیں۔

آپ کی وفات سرزمینِ گجرات میں زہر کے اثر سے ہوئی، جو اکبر شاہ کے حکم سے آپ کو دیا گیا تھا، جیسا کہ خوافی نے ''مَآثِرُ الأُمَرَاء'' میں اس کی صراحت کی ہے۔ یہ واقعہ ۹۹۰ھ، یا ۹۹۱ھ کا ہے۔

۴۴ : امام مہدی کے احوال کی تحقیق میں لکھے گئے موصوف کے رسالے کا ورقہ ۴۳، دیکھیں، جو کلیہ شرقیہ، پشاور کی لائبریری میں آپ کے مخطوط رسائل کے ضمن میں موجود ہے۔

ہجری) اپنی ترکی کتاب تحفہ خطاطین میں رقم طراز ہیں: ملا علی مذہبا حنفی، اور مشربا نقشبندی تھے۔(۴۵)

ملا علی قاری نے لکھائی مشہور خطاط شیخ حمد اللہ اماسی (۴۶) سے سیکھی، اور خط ثلث اور خط نسخ میں کامل مہارت حاصل کرلی تھی۔ خط نسخ اور ثلث میں انتہائی خوبصورت لکھائی کیا کرتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ کی کمائی، کتابت کی مصروفیت سے گزر بسر کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد طاہر بن عبدالقادر کردی مکی نے اپنی کتاب: "تاريخ الخطِّ العَرَبِيِّ وآدابه" میں کہا ہے: "ملا علی قاری بہت خوبصورت لکھا کرتے تھے، اور غالباً انہوں نے لکھائی شیخ حمد اللہ اماسی سے سیکھی تھی۔ اور ایک سال میں قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھا کرتے، اور بیچ دیتے۔ اور اسی کی قیمت سے پورا سال گزارا کرتے"۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب "زادُ المُتَّقِيْن" میں شیخ علی متقی کے حالات زندگی میں کہا ہے: وہ ایک عجمی شخص تھے۔ انتہائی خوشخط تھے۔ لوگ انہیں ملا علی قاری کہتے تھے۔ شیخ علی متقی نے ان کے فضل وکمال کے اعتراف کے طور پر، اور ان کی حاجت کے پیش نظر، ان سے بارہ 'جَدِيْد' (کرنسی کے روپیوں) کے عوض تفسیر جلالین کا ایک ایسا نسخہ خریدا تھا جو انہوں (ملا علی قاری) نے خود لکھا تھا۔ اور شیخ علی متقی ان کے بارے میں کہتے تھے: اس نے تو خوبصورت کتابت میں جان ہی کھپا دی ہے۔ اور اس کتابت والی تفسیر کا حق تو یہ ہے کہ جتنے پیسے میں نے اسے دیے ہیں، اس سے بھی زیادہ میں اسے خریدا جائے۔ اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب اہل مکہ کا لکھا ہوا تفسیر جلالین کا ایک نسخہ بس ایک جدید (روپے) میں مل جاتا تھا۔ (۴۷)

وہ عبارت جو سید صدیق حسن قنوجی نے "اِتّحافُ النُّبلاءِ المُتَّقِيْن عَن زَادِ المُتَّقِيْن" میں شیخ علی متقی کے حالات زندگی میں نقل کی

۴۵: تحفۂ خطاطین ص۳۲۴، استنبول، ۱۹۲۸ء۔

۴۶: آپ شیخ حمد اللہ بن شیخ مصطفیٰ وده اماسی ہیں، جو ابن شیخ کے نام سے معروف تھے۔ آپ کے والد شیخ مصطفیٰ نے بخارا سے اماسیہ کی طرف ہجرت کی، اور اسی کو وطن بنالیا۔

شیخ حمد اللہ کی پیدائش ۸۴۰ھ کو ہوئی۔ آپ نے علم حاصل کیا، پھر خوش نویسی کی طرف راغب ہوئے، چنانچہ آپ نے استاذ خیرالدین مرعشی سے کتابت سیکھی۔ یہ سلطان سلیم خان اور سلطان سلیمان خان کے عہد کی بات ہے۔ ان دنوں اکثر خطاط لکھائی میں شیخ مرعشی ہی کے قواعد اور طریقے کی اتباع کیا کرتے تھے۔ آپ نے کتابت میں انتہائی مہارت حاصل کرلی تھی، چنانچہ آپ کے خطی آثار اور یادگاریں کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے چھوٹے بڑے خط میں سینتالیس (۴۷) مصاحف لکھے۔ مزید "مشارق الأنوار" کو لکھا۔ سورۃ الانعام، سورۃ الکہف اور پارۂ عمّ کے تقریباً ایک ہزار نسخے لکھے۔ بہت سارے رقعات وقطعات بھی لکھے۔ جامع سلطان بایزید کی محراب، اس کے قبے، اس کے درمیانی دروازے اور اس کے علاوہ اور کئی جگہوں پر آپ نے کتابت کی ہے..... آپ نے ایک سو دس سال عمر پائی، اور اسکدار میں مدفون ہوئے۔ ترکی زبان میں لکھی گئی بہت ساری کتب میں آپ کے حالات زندگی موجود ہیں، جیسے: "كلدوحة الكتاب"، کتاب "ھنروران"، کتاب "گلزار صواب"۔ تحفہ سے مختصراً آپ کے حالات نقل کیے گئے"۔

محمد طاہر کردی کی تالیف: "تاريخ الخط العربي" (صفحہ ۳۲۱، مصر، سنة ۱۳۵۸ھج) کی عبارت مکمل ہوئی۔

۴۷: ایضاً ص ۲۹۲۔

ہے۔ مکمل ہوگئی۔ (۴۸)

میں نے خود ۱۳۷۷ھ میں، ملا علی قاری کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن مجید، عالم کبیر شیخ محمد ہاشم مجددی کے پاس مغربی پاکستان، سندھ کے علاقے ٹنڈو سائیں داد میں دیکھا تھا۔

ملا علی قاری اپنی کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم پر ہی قناعت کرتے تھے۔ ان کی زندگی میں زہد و عفت اور بقدر کفایت پر راضی رہنے کی صفت بہت نمایاں تھی۔ لوگوں سے بہت کم ملتے، انتہائی متقی، اور عبادت میں مشغول رہنے والے تھے۔ اور ہر وقت پوشیدہ و سرگوشی کو جاننے والی ذات میں مگن رہتے۔

ملا علی قاری سن رشد ہی سے استفادہ علمی اور طلب علم میں مشغول رہے۔ اکابر علماء کے ساتھ طویل وقت گزارا۔ حتیٰ کہ اصول، حدیث، تفسیر، تصوف، اور معقولات میں انتہائی ماہر ہو گئے، اور اپنے ہم عصر علماء سے فائق شمار ہونے لگے، اور ان کی شہرت امام، علامہ کبیر اور مفکر کی حیثیت سے ہونے لگی۔ اور یہ بھی کہ وہ بہت سے علوم عقلیہ ونقلیہ میں ماہر ہیں، فن حدیث وتفسیر، قراءت واصول، اور علم کلام پر دسترس رکھتے ہیں۔ عربیت، علم لسانیات، اور بلاغت میں سے ہر ایک پر مکمل گرفت ہے۔ اور ان تمام فنون وعلوم کی باریکیوں کو خوب جانتے ہیں، اور ان کے محاسن وغوامض کی پرکھ کے ساتھ ساتھ، عمیق مباحث اور مشکل مقامات کے حل پر قادر ہیں۔ انہی صفات کی وجہ سے ان کا شمار کامل اور راسخین فی العلم علماء میں ہونے لگا۔ آپ میں اتنے کمال جمع تھے کہ آپ کا ذکر ضرب المثل کے طور پر کیا جانے لگا۔ مؤرخین نے آپ کے بہت سے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔

چنانچہ محمد امین بن فضل اللہ دمشقی محبی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "خُلَاصَةُ الْأَثَرِ فِي تَرَاجِمِ أَعْيَانِ الْقَرْنِ الحَادِي عَشَر" میں کہا ہے:

"علی بن سلطان محمد، ہروی، جو قاری کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مکہ میں آ کر رہنے لگے تھے۔ علم کے ستون، یگانۂ عصر، تحقیق علم، اور تنقیح عبارات کے فن میں ایک نشان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی شہرت اس قدر ہے کہ ان کے اوصاف بیان کرنے سے کفایت کر جاتی ہے"۔ (۴۹)

عبدالملک بن حسین عصامی مکی شافعی نے "سِمْطُ النُّجُوْمِ وَالعَوَالِي فِي أَنبَاءِ الأَوَائِلِ وَالتَّوَالِي" میں کہتے ہیں:

۴۸: اس کی فارسی عبارت درج ذیل ہے:

در "زاد المتّقين" بذكر شيخ علي متقي نوشته كه مردے بود از اهل عجم، خوش خط، او را ملا علی قاری گویند. بملاحظه فضيلت و اهليت وافلاس او تفسير جلالين بدوازده جديده خريدند، وهنوز می گفتند كه عجائب مشقت كشيده است، بزياده می توان گرفت۔ وتفسير مذكور بخط اهل مكه بيك جديد بهم می رسد. انتهیٰ.

دیکھیے: إِتحافُ النُّبلَاءِ المُتَّقِين بمَآثِرِ الفُقَهاء المُحدِّثين: ص ۳۲٦، مطبع نظامی، کان پور، سنه ۱۲۸۸ھ۔

۴۹: خلاصة الأثر ۳: ۱۸۵، مصر سنة ۱۲۸٤ھ۔

''شیخ ملا علی قاری .... علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع، سنت نبویہ کے ماہر، حفظ وتفہیم کے ماہر لوگوں میں سے ایک تھے''۔(۵۰)

سید صدیق حسن قنوجی نے اپنی کتاب ''اتّحاف النُّبلاءِ المُتَّقِیْن'' میں ملا علی قاری کے حالات زندگی ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''سید محمد بن ابی بکر باعلوی نے اپنی کتاب ''عَقْدُ الجَوَاهِرِ وَالدُّرَر'' میں ان کے حالات زندگی کے بارے میں کہا ہے:

''وہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع تھے۔ سنت نبویہ کے ماہر، اور حفظ وتفہیم کے ماہر لوگوں میں سے ایک تھے''۔(۵۱)

انہی کے بارے میں حافظِ عصر علامہ شیخ محمد عابد سندی مدنی (ت ۱۲۵۷ھ) اپنی کتاب: ''المَوَاهِبُ اللَّطِيفَةُ عَلَى مُسْنَدِ الإِمَامِ أَبِي حَنِيفَة'' میں کہتے ہیں:

''شیخ، علامہ، گہرے عالم، انتہائی زیرک، شیخ ملا علی قاری ....''۔(۵۲)

اور ان کے بارے میں شیخ علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی (ت ۱۳۰۴ھ) اپنی کتاب ''التَّعْلِيقُ المُمَجَّد عَلىٰ مُوَطَّأ مُحَمَّدٍ'' کے مقدّمے میں لکھتے ہیں:

''صاحب علم، ظاہر وباہر فضل ولیاقت والے علی قاری ہروی، مکی ....''۔(۵۳)

آں موصوف مزید اپنی کتاب: ''السِّعَايَة فِي كَشْفِ مَا فِيْ شَرْحِ الوِقَايَة'' کے مقدّمے میں رقم طراز ہیں:

''وہ جلیل القدر محدث، اور زیرک محقق ہیں ....''۔(۵۴)

شیخ عالم فقیہ حسین بن محمد سعید عبدالغنی مکی حنفی، اپنی کتاب: ''إِرْشَادُ السَّارِي إِلىٰ مَنَاسِكِ المُلاَّ عَلِيٍّ القَارِيِّ'' میں یہ ایں عبارت رقم طراز ہیں:

''علی بن سلطان محمد قاری: اپنے زمانے کے علامہ، یگانہء عصر، یکتائے روزگار، انواع واقسام کے علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع، قرآن اور سنت نبویہ کے علوم کے ماہر، بلد اللہ الحرام اور مشاعر عظام سے پُر شہر کے عالم، اور بڑے علماء میں سے ایک، اور اہل تحقیق وافہام مشاہیر میں سے ایک تھے''۔(۵۵)

---

۵۰ : سمط النُّجوم العوالي ٤ : ٣٩٤.

۵۱ : اتحاف النبلاء المتقين ص ٣٢٥.

۵۲ : المواهب اللطيفة على مسند الإمام أبي حنيفة: ورقة ٢. ہم نے اس کا بخط المؤلف مخطوط، سندھ میں چوتھے حاملِ پرچم کے کتب خانے: کتب خانہ پیر جھنڈو، سید محب اللہ شاہ، میں خود دیکھا ہے۔ اور اس کتاب کا ایک ناقص نسخہ اہل علم سے محبت رکھنے والے، کراچی کے شیخ بشیر محمد کے پاس بھی ہے، جو کارخانہ تجارتِ کتب، کراچی کے مالک ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

۵۳ : التعليق الممجّد علىٰ موطأ محمد: ص ١٩، المطبعة اليوسفي لكهنو هند، سنة ١٣٤٦هج.

۵۴ : مقدمۂ سعاية في كشف ما في شرح الوقاية: ص ٣٩، المطبعة المصطفائية، لكهنو، هند، سنة ١٣٠٦هج.

۵۵ : إرشاد الساري إلىٰ مناسك الملاّ عليّ القاري: ص ٥.

اور مشہور محقق، ماہر محدث شیخ محمد ادریس کاندھلوی اپنی کتاب: "التَّعْلِيْقُ الصَّبِيْحُ عَلٰى مِشْكَاةِ الْمَصَابِيْحِ" میں کہتے ہیں کہ:

''محدث جلیل، زیرک فاضل، یگانہ عصر، یکتائے روزگار شیخ نور الدین علی بن سلطان محمد ہروی قاری ...''۔(۵۶)

ملا علی قاری حنفی انتہائی دین دار، متقی، پرہیزگار، فقیہ، علوم کے ماہر، وسیع روایت والے، وسیع معلومات والے اور گہری فہم وفراست والے تھے۔ مکمل آزادیِ رائے سے کام لیتے، اور وہی کچھ کرتے اور کہتے تھے جو ان کے نزدیک کتاب وسنت اور اجماع کی دلیل سے ثابت ہو جاتا۔ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہوتا اسے رد کر دیتے، خواہ اس کا قائل کوئی چھوٹا ہوتا یا بڑا ہوتا، امام ہوتا یا مجتہد ہوتا۔ اور اس کی غلطی کو ظاہر کر دیتے۔ اور اس ایک قول کی تائید کرتے جو قرآن وحدیث اور اصول کے موافق ہوتا۔ تحقیقات ومباحثات میں ان کا طریق کار یہی تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کے بعض معاصر مالکی اور شافعی علماء نے ان کے مقابلے کی ٹھان لی۔ اور تعصب مذہبی نے انہیں اس حد تک پہنچا دیا کہ انہوں نے ملا علی قاری کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے کلام کو دیکھنے سے منع کر دیا۔

علامہ محبی نے "خُلَاصَةُ الْأَثَرِ" میں کہا ہے:

''لیکن وہ ائمہ، خصوصاً امام شافعی اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ پر علمی تنقید کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ انہوں نے نماز میں ہاتھ لٹکانے کے بارے میں امام مالک پر اعتراض کرتے ہوئے، ان کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔ اور اس کا جواب شیخ محمد مکین نے دیا، اور ان کے جواب میں ایک رسالہ لکھا جس میں ان کے تمام اقوال کا جواب دیا، اور ان کے تمام اعتراضات کا رد کیا''۔(۵۷)

مؤرخ عبد الملک عصامی نے کہا ہے:

''وہ ائمہ کرام، خصوصاً امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب پر (علمی) تنقید کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہوئے۔ اور انہوں نے امام مالک پر (نماز میں) ہاتھ لٹکانے کے بارے میں اعتراض کیا۔ اسی لیے تم دیکھو گے کہ ان کی تالیفات میں علم کا نور نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے بہت سے علماء اور اولیاء نے ان کی کتابیں پڑھنے سے منع کیا ہے''۔(۵۸)

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ میں علماء کے اختلاف کے کئی درجات ہیں۔ حمد بن محمد خطابی (ت ۳۸۸ھ) نے کہا ہے:

''نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' اور دین میں اختلاف کی تین قسمیں ہیں:

۱ : ان میں سے ایک تو صانع اور اس کی واحدانیت کے اثبات میں ہے۔ اس کا انکار تو کفر ہے۔

۲ : دوسرا اللہ کی صفات کے بارے میں ہے، اور اس کا انکار کفر ہے۔

---

۵۶ : التعليق الصّبيح علىٰ مشكاة المصابيح: مقدمة ص ٦، طبع دمشق.

۵۷ : خلاصة الأثر ٢ : ١٨٦.

۵۸ : سمط النجوم العوالي ٤ : ٣٩٤.

۳ : اور تیسرا فروع کے ایسے احکام کا اختلاف ہے جس میں کئی ایک وجوہ کا احتمال ہوتا ہے۔ بس یہی وہ اختلاف ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رحمت اور کرامت کا ذریعہ بنایا ہے''۔(۵۹)

امام نووی کہتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو کفر اور بدعت تک پہنچا دے، جیسے کہ یہود ونصاریٰ کا اختلاف ہے۔ اور اس کی مثال خود قرآن میں اختلاف کرنا ہے، یا اس کے معنی میں ایسا اختلاف کرنا ہے جس میں اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہے، یا (شریعت کی) کسی ایسی چیز میں اختلاف کرنا ہے جو شک وشبہ اور فتنے میں مبتلا کر دے۔ اور جہاں تک ایسے اختلاف کا تعلق ہے جو دین کے کسی فرعی مسئلہ میں استنباط کے وقت ہو، اور کسی فائدے، یا حق کے اظہار کے لیے اہل علم کے مناظرہ کے وقت ہو، تو وہ نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ یہ تو مامور بہ ہے۔ اور اس کی فضیلت بالکل ظاہر ہے۔ اور اس کے جواز پر عہد صحابہ سے آج تک کے تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔''۔(۶۰)

اور ملا علی قاری نے بھی بعینہ وہی بات کہی ہے جو امام خطابی اور نووی نے کہی ہے۔ چنانچہ اس حدیث: ''اِتَّبِعُوْا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ'' کی شرح میں کہتے ہیں:

''بڑی جماعت کو سوادِ اعظم سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس سے مراد وہ بات ہے جس پر اکثر مسلمان ہوں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ اصول اعتقاد کے بارے میں ہے، جیسا کہ ارکان اسلام ہیں۔

اور باقی رہے فروعی مسائل، جیسے (ذکر کو) چھونے سے وضو ٹوٹ جانا وغیرہ، تو ان میں اجماع کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ بلکہ ائمہ اربعہ میں سے کسی بھی ایک مجتہد کی اتباع کر لینا جائز ہے۔

اور وہ اختلاف جو ماتریدیہ اور اشعریہ کے درمیان چند مسائل میں واقع ہوا ہے، تو درحقیقت وہ بھی فروعی نکات ہی میں ہے۔ کیونکہ وہ مسائل ظنیات میں سے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: یہ اختلاف اعتقادیات کے ایسے مسائل میں نہیں ہوا جن کی بنیاد یقینیات پر ہے؛ بلکہ بعض محققین خلف نے تو یہاں تک کہا ہے کہ: ان دونوں (اشاعرہ وماتریدیہ) میں تمام اختلافات لفظی ہی ہیں''۔(۶۱)

ملا علی قاری کی اس تصریح، اور امام خطابی اور نووی کی نقل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ: وہ اختلافی مسائل میں وسیع الصدر تھے۔ اور ان کے نزدیک فروعی اختلاف میں بہت گنجائش ہے۔ بلکہ ایک دوسری جگہ انہوں نے بڑی صراحت سے یہ بات کہی ہے کہ: کسی شخص کا اپنے اقران سے کسی فن میں زیادہ کامل وماہر ہونا اجتہاد کی علامت ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

''اور صحیح بات یہی ہے کہ ہر وہ شخص جو فقہی فروع کی تخصیص کے بغیر، علوم شرعیہ میں سے کسی بھی فن میں اپنے معاصرین پر فائق ہوا،

---

۵۹ : مرقاة المفاتيح ٥ : ٤٩٩، طبع مصر.

٦٠ : أيضًا ١ : ١٨٩.

٦١ : مرقاة المفاتيح ١ : ٢٠٥، طبع مصر.

وہ ائمہ مجتہدین اور علماء راسخین و کاملین و مکملین میں سے ہوا ہے"۔ (۶۲)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ علوم شرعیہ میں ان کی جلالتِ شان، اور علوم نقلیہ میں ان کا یدِ طولیٰ حاصل ہونا، اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ وہ علماء راسخین میں سے تھے۔ دیارِ یمن کے محدث شیخ الاسلام محمد بن علی شوکانی کے قربان جاؤں، کہ انہوں نے ملا علی قاری کے ائمہ کے ساتھ اختلاف کو ان کے حدیث وفقہ اور علم کلام میں ماہر و کامل ہونے، اور ان علوم وفنون میں مجتہد ہونے کی دلیل شمار کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے (ملا علی قاری کے بارے میں) عصامی کے گذشتہ (تنقیدی) کلام کو نقل کرنے کے بعد یہ کہا ہے:

"میں کہتا ہوں: یہ تو ان کی علوِّ منزلت کی دلیل ہے۔ کیونکہ مجتہد کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ صحیح دلیل کے خلاف کی جانے والی بات کو واضح کرکے، اس پر اعتراض کرے۔ برابر ہے کہ اس کا قائل کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔

تِلْكَ شُكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

ترجمہ: یہ لوگ جو تیرے شکوے کر رہے ہیں، ان کا عیب وطعنہ ہونا ظاہر ہی ہے۔ (۶۳)

ہندوستان میں اہل حدیث حضرات کے بلا مدافعت امام سید صدیق حسن خان قنوجی نے "اِتْحَافُ النُّبَلَاءِ" میں عصامی کا مذکورہ قول نقل کرنے کے بعد کہا ہے:

"ان سطور کا لکھنے والا کہتا ہے: جس نے بھی ملا علی قاری پر اعتراضات کیے، انہوں نے اس کا رد لکھا ہے۔ اور وہ میرے پاس موجود ہے۔ بلکہ میرے پاس ان کی فقہ اور حدیث میں لکھی ہوئی تقریباً چالیس کتابیں ہیں۔ اور ان کی تصانیف میں سے ہر ایک، غایت تحقیق اور اس علم کے ساتھ اچھی مناسبت پر دلالت کرتی ہے۔ اور ان کی تمام کتابیں تلقی بالقبول کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اور اہل علم کے ہاں متداول ہیں۔ لہٰذا یہ بات کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ: ان کی تالیفات میں علم کا نور نہیں ہے۔ بلکہ اس زمانہ میں کوئی حنفی ملا علی قاری جیسا منصف محقق، کم ہی ہوگا..... انہیں فقہ وحدیث میں تحقیق کا یدِ طولیٰ، اور علم کلام ومعقولات کی باریکیوں پر اچھی گرفت حاصل تھی۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انہوں نے نماز میں ہاتھ لٹکانے کے معاملے میں امام مالک پر اعتراض کیا ہے، اور ایسے ہی بعض مسائل میں بعض اصحاب شافعی پر تنقید کی ہے، تو اس کی بنا عصبیت مذہبی اور نری خواہش نفسانی نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد اس مسئلہ کے خلاف دلائل کا واضح ہو جانا ہے۔ اور ایسا اختلاف تو متقدمین ومتاخرین علما میں پہلے بھی، اور اب بھی چلا آ رہا ہے، اور کوئی انہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ان کا کلام مکمل ہوا۔ (۶۴)

محرر سطور گوید: ملا علي قاري را جواب الجواب اين رسالها واز تصانيف او قريب چهل رساله بخط خاص وے در

---

۶۲ : أيضًا ۱ : ۱۸۸۔

۶۳ : البدر الطّالع ۱ : ۴۴۳ – ۴۴۵، طبع مصر۔

۶۴ : اس کی فارسی عبارت درج ذیل ہے:

...... فقه وحديث نزد فقير ست .... همه تواليفش مقبول ست، ودر اهل علم متداول. پس نبودن نور علم بران يعنی چه بلكه در فقهائے حنفيه كم كسے مثل او منصف مزاج محقق طبع درين دور بر خاسته .... ودر تحقيق فقه وحديث ودريافت علوم كلام ومعقول يد طولیٰ دارد از هر كتاب اور رتبهٔ تحقيق نمايان ست دستگاه او دراں علم عيان واعتراض او بر ارسال مالك واصحاب شافعی در بعض مسائل نه از راه عصبيت وهواست، بلكه بر بنا وضوح ادلّه بر خلاف آں. واين قسم اختلاف در جميع اصناف علماء قديماً وحديثاً موجود ست، مخصوص بوے نيست.

اتحاف النبلاء المتقين ص ٣٢٥ - ٣٢٦.

لیکن ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی اپنی کتاب "التعليق الممجّد علیٰ موطأ محمّد" میں رقم طراز ہیں:

"آپ کی تمام تصنیفات جامع، مفید اور لطیف فوائد پر مشتمل ہیں۔ اگر ان میں سے بعض میں تعصب مذہبی کی بو نہ ہوتی تو بہت ہی اچھی بات ہوتی"۔

ان قیمتی تالیفات اور انوکھی تحقیقات کے باوجود، ان کی بعض تالیفات میں، بعض جگہوں پر زیرِ بحث مسئلہ کی کافی وافی شرح اور سیر حاصل بحث نہیں ہوتی۔ اسی لیے شیخ محدث فقیہ محمد حسن سنبھلی (ت ۱۳۰۵ھ) اپنی کتاب "تنسيق النظام في مسند الإمام" میں آپ ﷺ کی اس حدیث:

"انصَرَفَ النبيُّ ﷺ من صلاة الظُّهر أو العصر، فقال: "مَن قرأ منكم بسَبِّح اسم ربِّكَ الأعلى" فسكت القومُ، حتّٰى سأل عن ذلك مراراً. فقالَ رجلٌ من القوم: أنا يا رسولَ اللّٰه ﷺ! قال: لقد رأيتُك تنازعُني أو تُخالجُني القرآن"،

کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

إن القاري الحنفي، حالُه عجيب جدا، يورد وينقل الروايات الموافقة والمخالفة رطباً ويابسا، صحاحا وضعافاً، ولا ينقح الأحاديث، ولا يميز بينهما، ولا يرفع التدافع والتعارض، ولايحملها علىٰ محامل صحيحة، لا علىٰ مقتضىٰ مذهبه، ولا علىٰ غيره، مع تصلّبه في مذهب الحنفية.

فأورد ههنا مع الرواية الأولىٰ رواية ابن حبان عن أنس في قراء ة الفاتحة خلف الإمام، ومنع غيرها، ورواية أبي داود عن عبادة نحو ذلك، ورواية أحمد وعبد بن حميد وأبي‌يعلىٰ وابن ماجة في قراء ة الفاتحة سراً، ورواية أبي‌هريرة في قراء ة الفاتحة في سكتات الإمام، ورواية الترمذي وأبي داود عن عبادة في وجوب الفاتحة خلف الإمام أيضًا، في الجهرية أيضًا.

ولم يجب بعد هذا الإيراد بشيء، وسكت عنه. ومع الرواية الأخيرة رواية الحاكم عن عبادة في وجوب قراء ة الفاتحة خلف الإمام أيضًا، فلعله فهم أن هذه الروايات مؤيدة بما رواه عن هذه الكتب، حتىٰ لم يجب عنه بشيء. وهذا عجيب عن مثله ونحن نشمر الذيل للجواب عنه من قبل الحنفية - فيما سيأتي -.

میں کہتا ہوں: بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے تیار نہیں ہوتا، بلکہ محض سرد وذکر پر اکتفا کر کے بغیر کوئی نقد کیے گزر جاتا ہے۔ اور مسند امام اعظم کی مذکورہ بالا شرح متوسط شرح ہے، جس میں ملا علی قاری نے زیرِ بحث مسائل کی تمام جوانب کا احاطہ کرنے، اور ان کا ناقدانہ جائزہ لینے کا التزام ہی نہیں کیا۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ کا تمام تالیفات میں وہ اسلوب نہیں ہے جو شیخ سنبھلی نے بیان کیا ہے۔ ملا علی قاری ہی نے مشکوٰۃ کی شرح میں اس مسئلہ پر بڑا تفصیلی کلام کیا ہے، اور اس کے ما لها وما عليها پر بڑی مبسوط بحث کی ہے۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو کچھ محمد مکین اوران کے علاوہ دوسرے معاصرین نے ان کے بارے میں کہا ہے، ان کی بنیاد محض تعصب ہے۔اور معاصرت کی وجہ سے جو خلاف ظاہر ہو، اس کی بنیاد یا تو دنیوی منافست ہوتی ہے، یا مذہبی عصبیت ہوتی ہے ۔اور مثل مشہور ہے کہ: صرف معاصرت ہی منافرت کے لیے کافی سبب ہے۔اسی وجہ سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے :

''ہم عصر لوگوں میں بعض کا بعض کے بارے میں جرح کرنا غیر مقبول ہے۔اور مجھے صحابہ وتابعین کے سوا کوئی زمانہ ایسا معلوم نہیں ہے جس کے لوگ اس سے محفوظ رہے ہوں'' (۶۵)۔حافظ صاحب کا کلام مکمل ہو گیا۔

اور جہاں تک ارسال کے مسئلے کا تعلق ہے تو یہ بات کسی سے پوشیدہ نہ ہو گی کہ عام اہل علم کے ہاں یہ قول ضعیف ہے۔اور بہت بعید سی بات ہے کہ وہ امام مالک کے حق میں ایسے مسئلہ کے بارے میں کلام کریں جس سے وہ بری ہیں۔

اور باقی رہی بات ملا علی قاری کے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کرنے کی، تو اس بارے میں شیخ جمیل بک عظم نے اپنی کتاب: "عُقُودُ الجَوْهَرِ فِي تَرَاجِمِ مَن لَهُم خَمْسُوْنَ تَصنِيْفاً فَمِئَةً فَأَكْثَر" میں کہا ہے:

''میں یہ کہتا ہوں: ان کا امام شافعی رحمہ اللہ پر اعتراضات کے درپے ہونا محل نظر ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ایک رسالہ تالیف کیا تھا، جس میں انہوں نے اس شخص کا رد کیا تھا جو ان کی طرف اس بات کی نسبت کرتا ہے کہ انہوں نے امام شافعی کی تنقیص کی ہے اوران پر اعتراضات کیے ہیں۔ہاں! انہوں نے: "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" نامی ایک رسالہ ضرور تصنیف کیا تھا، جس میں انہوں نے ان بعض مسلکاً شافعی لوگوں کا رد کیا ہے جنہوں نے امام اعظم رحمہ اللہ کے مذہب، بلکہ امام اعظم رحمہ اللہ کی ذات کو نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے زبان کھولی ہے''۔(۶۶)

اور ملا علی قاری نے اس معاملے کی تفصیل، اپنے رسالے "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" کی ابتدا میں بایں الفاظ ذکر کی ہے:

''جب میں نے بعض شافعی حضرات کے رسائل میں ائمۂ حنفیہ رحمہم اللہ کے بارے میں طعن وتشنیع، اور انتہائی ناگوار قسم کی رد وقدح کی باتیں دیکھیں تو اس موضوع پر ان کے رد کے لیے میں نے "تَشْيِيْعُ فُقَهَاءِ الحَنَفِيَّةِ لِتَشْنِيْعِ سُفَهَاءِ الشَّافِعِيَّةِ" نامی ایک رسالہ لکھا ۔پھر یہ رسالہ مکہ کے فقہاء وعوام میں پھیل گیا، تو بعض لوگوں پر تو گویا قیامت ہی قائم ہو گئی، اوران کی جاہلیت کی رگ پھڑکی، اور ہمیں

---

۶۵ : محبی نے "خلاصة الأثر" (۲: ۴۶۴) میں یہ کلام نقل کرنے کے بعد کہا ہے:

میں کہتا ہوں: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس قول کہ: ''صحابہ وتابعین کا زمانہ اس سے مستثنیٰ ہے''، میں مجھے تأمل ہے۔اس لیے کہ وہ بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔جیسا کہ ان حضرات کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہوگا۔اس لیے ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ: حافظ صاحب کا قول عمومی حالات پر محمول ہے۔اور شاید ان کا یہ کلام اکثری اور غالب احوال پر مبنی ہے، اس لیے کہ بعد میں آنے والے حضرات کی بہ نسبت ان میں یہ بات بہت ہی کم پائی جاتی ہے۔واللہ اعلم''۔

۶۶ : "عقود الجوهر في تراجم من لهم خمسون تصنيفاً فمئة فأكثر" صفحه ۲۶۴، بيروت، سنة ۱۳۲۶ هج.

ملامت کرنے کے لیے، انہوں نے ہر خاص وعام، جاہل، شیخی باز، اور بازاروں میں چیخنے والے بازاری قسم کے لوگوں کے سامنے زبان طعن دراز کرنی شروع کی، اور کہنے لگے کہ: فلاں آدمی نے امام شافعی رحمہ اللہ کو گالی دی ہے۔ اور ان کے مذہب کے، امام نووی اور رافعی جیسے متبعین کو طعن و تشنیع کی ہے ....، اور ان موضوعات پر گفتگو اور تحقیق کرنے میں میرے سامنے آنے سے عاجز ہو گئے، .... اور (اس فتنہ بازی کی وجہ سے) عوام الناس میں بھی جھگڑے، اور بحث ومناظرے ہونے لگے، حتیٰ کہ قتل وقتال تک کا خطرہ پیدا ہو گیا، تو مجھے اپنے کمزور متقدمین کا قول یاد آ گیا، اور میں نے دعا کی: "رَبَّنَا لَا تُخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا، وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔

مذکورہ بالا صورت حال میں، قابل احترام شیخ الحرم، بہت ہی اچھے خصائل کے مالک اور پرکشش عادات کے مالک جناب مولانا بدر الدین حسن (اللہ ان پر بہت فضل واحسان کرے)، نے میرے معاملے کو سنبھالا، اور مولانا ومقتدا، ماہر محقق، نکتہ رس، کئی مفید کتابوں کے مصنف، جادۂ نبوی پر مستقیم کئی قابل قدر تصنیفات کے مؤلف، اور راہ مصطفوی ﷺ پر قائم رہنے والے، مولانا قاضی حسین کفوی (۶۷) نے میری نصرت وحمایت کا بیڑا اٹھایا، (اللہ انہیں دنیاوی انعامات کے ساتھ ساتھ اخروی اکرام واعزاز بھی عطا فرمائے)۔ او رانہوں نے ان (معترض) لوگوں کے لیے چمکتی ہوئی کاٹنے والی تیز تلوار سونتی، اور یہی بات میرے اور ان کے درمیان جامع مانع حد بن گئی۔ اور ان دونوں حضرات کو اللہ تعالیٰ کی رضا ونصرت ملے، ان کی طرف سے میری حمایت کا اظہار، اسی وجہ سے تھا کہ ظل سلطانی، سیف برہانی، کی حکومت ان دونوں کی نظر میں بڑی قوت میں تھی۔ اللہ ان کی حکومت کو، اور ظالم وکافر، دین کے دشمنوں کے خلاف ان کے مددگار دوستوں کی نصرت ومدد کو دوام بخشے۔ اور ان دونوں حضرات کا میری مدد کرنا، اہل حرمین شریفین کے حامی، اور ان بابرکت مقامات کے سکونت پذیر لوگوں کے ذمہ دار مولانا کی رعایت کی وجہ سے تھا۔ (اللہ انہیں سید الثقلین ﷺ کی برکت سے، دارین کی آفات سے محفوظ رکھے)۔

۶۷: آپ کے بارے میں مؤرخ محبی (ت ۱۱۱۱ھ) نے "خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر" (۲: ۱۲۱-۱۲۲) میں یہ کہا ہے:

"حسین بن رستم کفوی، رومی حنفی۔ روم کے موالی میں سے ایک تھے۔ علم وفضل اور فنون میں مہارت رکھنے کی وجہ سے مشہور تھے۔ ابن نوعی نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ پھر کہا ہے: آپ قسطنطنیہ آئے اور شہر کے قاضی داود زادہ کے پاس حاضر باش رہنے لگے۔ ان سے پڑھتے رہے حتیٰ کہ مدرسہ سلیمانیہ میں جا پہنچے۔ پھر شعبان ۱۰۰۷ھ میں وہاں سے قدس کی قضاء کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ پھر آپ شوال ۱۰۰۸ھ میں مکہ مکرمہ کے قاضی بنائے گئے۔ صفر المظفر ۱۰۱۰ھ میں قضاء کی ذمہ داری کو چھوڑا۔

آپ صاحب لطائف وفضائل تھے۔ اپنے زمانے میں اہل معرفت میں سب سے زیادہ نکتہ رس اور ذہین تھے۔ اب تک ان کے لطائف اور اشعار وآثار زبان زد عام ہیں۔

آپ کی جلیل القدر تالیفات میں سے بخاری ومسلم شریف پر آپ کی تعلیقات ہیں۔ اس کے علاوہ ترکی زبان میں آپ نے گلستان سعدی کی شرح بھی لکھی، جس میں گلستان کے شارحین سروری اور شمعی سے بھی تعرض کیا ہے۔ آپ کی ایک کتاب "فالنامہ" بھی ہے جس میں ان لوگوں......

چنانچہ میں نے اس حمایت کے ظاہر ہونے پر الحمد للہ کہا، اور یہاں جو کچھ بھی ہوا، اس میں ثابت قدم رہنے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس کے بعد دشمن بھاگنے لگے، اور ذلت و ہلاکت میں پڑ کر خائب و خاسر ہوئے۔ جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَاحَ الْبَاغِضُوْنَ وَ ھُمْ ☆ بِکَیْدِھِمْ ، فِي اعْتِذَارٍ لَا یُفِیْدُھُمْ

ترجمہ: الحمد للہ، بغض و دشمنی رکھنے والے اپنی ہی چال میں پھنس کر ایسے عذر کر رہے ہیں، جو انہیں ہرگز فائدہ نہ دیں گے"۔

اور محبی نے "خُلَاصَۃُ الأثر" میں کہا ہے:

.....کو پیش آنے والے بہت ہی عجیب و غریب واقعات ذکر کیے ہیں جو قرآن مجید اور دیوانِ حافظ وغیرہ سے فال نکالا کرتے تھے۔ یہ چھوٹی سی پر لطف کتاب ہے، میں نے اسے دیکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس سے بعض چیزیں نقل بھی کی ہیں۔

منجملہ ان واقعات کے ایک وہ واقعہ بھی ہے جسے انہوں نے قطب العارفین یعقوب چرخی سے حکایت کیا ہے کہ: انہوں نے اپنی بعض تصنیفات میں ذکر کیا ہے کہ عنایتِ الٰہی انہیں کھینچ کر خواجہ بہاء الدین نقشبند کے ہاں لے گئی۔ کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ: اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کے ساتھ انتہائی کرم اور عنایتِ التفات کا معاملہ ہے۔ اور مجھ پر ظاہر ہوا کہ آپ خواص اولیا میں سے، اور کامل و مکمل شیخ ہیں۔ چنانچہ میں نے آپ کے بارے میں قرآن مجید سے فال نکالی، تو یہ آیت نکلی: أُولٰئِكَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدَاھُمُ اقْتَدِہْ"۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ: جب مولی سنان، محشیٔ بیضاوی اور محشیٔ ہدایہ کا انتقال ہو گیا، تو بعض اہلِ دل حضرات نے قرآن مجید اٹھایا اور مولی سنان کے حسبِ حال فال نکالی تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول سامنے آیا: "وَلَقَدِ اصْطَفَیْنَاہُ فِي الدُّنْیَا، وَإِنَّہٗ فِي الْآخِرَۃِ لَمِنَ الصَّالِحِیْنَ"۔

اور خود اپنی بات نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے اور میری والدہ نے ۹۸۵ھ میں، اپنے شہر "کفہ" سے رحلت کا ارادہ کیا۔ لیکن اس امر میں تردد تھا کہ بحری راستہ اختیار کروں یا خشکی کا راستہ؟ میرے ذہن میں ایک طرف تو غرق ہونے کے خوفناک وساوس گردش کرنے لگے اور دوسری جانب انتہائی تھکاوٹ کا ڈر لگنے لگا۔ میں قرآن مجید سے فال نکالی، تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول سامنے آیا: "لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا، أَسْمَعُ وَ أَرَی"۔ اس کے بعد ایک دوسری فال نکالی، تو یہ آیت نکلی: "أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِہٖ"۔ میں نے اسے نیک فال سمجھا اور ہم سمندری جہاز میں سوار ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صحیح سلامت منزل پر پہنچ گئے۔

یہ حکایت بھی بیان کی ہے کہ: مولی معروف جو چند صاحب خیر عظیم المرتبت موالی میں سے ایک تھے، کہتے ہیں: میں نے ایک رات بہت ہی عظیم المرتبت قسم کا خواب دیکھا، جس کی وجہ سے میں بہت ہی خوش ہوا۔ جب نیند سے جاگا تو اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ خواب رحمٰن کی طرف سے تھا یا شیطان کی طرف سے تھا۔

چنانچہ میں نے علامہ سیوطی کی "الجامع الصّغیر" سے فال نکالی، تو رسول اللہ ﷺ کا یہ قول سامنے آیا: "رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ الصَّالِحِ بُشْرَی مِنَ اللّٰہِ، وھِيَ جُزْءٌ مِن خَمْسِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّۃِ"۔ قصہ مکمل ہوا۔

آپ کے اور نکساری زادہ کے درمیان ایک مرتبہ گفتگو بھی ہوئی تھی، جس کے بارے میں آپ نے بعد میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس میں انہیں مطعون بھی کیا تھا۔ آپ علم موسیقی میں نہایت ماہر تھے۔ آپ نے بعض اغانی مرتب کیے تھے جو مقبول و متداول ہیں۔

آپ کی وفات ۱۰۱۰ھ میں ہوئی۔

''اس سے بھی عجیب تر وہ بات ہے جسے سید محمد بن عبد الرسول برزنجی حسینی نے اپنی: "سِدَادِ الدِّيْنِ فِي إِثْبَاتِ النَّجَاةِ لِلْوَالِدَيْنِ" نامی کتاب میں نقل کیا ہے کہ:

''ملا علی قاری نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب "اَلفِقهُ الأَكبَر" کی شرح کی ہے۔ اور اس میں والدین مکرمین کے حق میں حدِّ ادب سے ہٹ کر، بے ادبی میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس موضوع پر ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے (۶۸)، اور قاضی عیاض کی "الشِّفَا، بتَعْرِيْفِ حُقُوْقِ الْمُصْطَفٰى" کی شرح میں بڑے فخر و ناز سے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''میں نے ان دونوں کے کفر پر مرنے کے بارے میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے''۔

اے کاش! جب اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کی کوئی رعایت ہی نہیں کی تھی، اور مذکورہ رسالہ لکھ کر آپ ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہی تھی تو کم از کم اس کا ذکر "اَلشِّفَا" جیسی کتاب کی شرح میں تو نہ کرتا، کہ جس کا موضوع ہی نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف اور افتخار کا بیان کرنا ہے''۔ اھ.

ملا علی قاری نے اس قول کو اس صحیح روایت کی وجہ سے اختیار کیا ہے جو حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ انہوں نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، تو رو پڑے، اور اپنے ساتھیوں کو بھی رلا دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: میں نے اپنے رب سے اس کی اجازت چاہی تھی کہ اپنی والدہ کے لیے استغفر کروں، لیکن مجھے اجازت نہیں ملی۔ پھر میں نے اپنے رب سے اس بات کی اجازت چاہی کہ ان کی قبر کی زیارت کرلوں، تو اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ تم بھی قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ موت کی یاد دلاتی ہیں''۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی شرح میں کہا ہے کہ:

ابن جوزی نے "كِتَابُ الْوَفَاءِ" میں ذکر کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ اپنے والد صاحب کی وفات کے بعد، اپنی والدہ آمنہ کے

۶۸: حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن میں کوئی فائدہ نہیں، اور ان میں سکوت اختیار کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی لیے شاہ عبد العزیز دہلوی نے اپنے رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' میں کہا ہے:

پھر یہ بھی ہے کہ انتہائی نادر قسم کے مسائل، جیسے نبی اکرم ﷺ کے ابوین کریمین کے اسلام کا مسئلہ، پاؤں پر مسح کرنے کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی شدہ روایات، اور ان جیسے دوسرے مسائل کی ابحاث انتہائی نادر الوقوع ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کی تخریج ان کتب (یعنی طبقۂ رابعہ کی کتب) میں کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ شیخ جلال الدین سیوطی کی اکثر جمع پونجی، اور رسائل و نوادر کی تصنیف میں ان کا اکثر راس المال، یہی مذکورہ بالا کتب ہیں۔ لہٰذا، ان کتب کی احادیث سے اشتغال، اور ان احادیث سے احکام کے استنباط کا کام ایسا عمل ہے جس کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ اس سب کے باوجود بھی اگر کسی کو ان احادیث کی تحقیق کرنا پسند ہو تو اسے چاہیے کہ حافظ ذہبی کی ضعیف رُوات کے احوال بیان کرنے والی کتاب "مِيزَانُ الِاعتِدَال" اور حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب "لسان الميزان" کو حرزِ جان بنائے۔

مزید دیکھیے: "الحطه في ذكر الصحاح الستة" (ص ۵۸)، المطبع النظامي، كان پور، ۱۲۸۳ هجری.

ساتھ رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ کی عمر مبارک چھے سال ہوئی، تو آپ کی والدہ آپ کو، آپ کے ماموؤں کے ہاں بنو عدی بن نجار کے پاس مدینہ میں ملانے لے گئیں۔ اور انہیں میں سے ابو ایوب بھی تھے۔ پھر آپ ﷺ کو لے کر مکہ کی طرف واپس روانہ ہوئیں۔ جب ''ابواء'' مقام پر پہنچیں، تو وہیں وفات ہوگئی، اور ان کی قبر بھی وہیں ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا، تو ابواء میں ان کی قبر کی زیارت کی۔ جب قبر کے پاس کھڑے ہوئے تو آنکھیں اشک بار تھیں۔ پھر ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اجازت چاہی، تو مجھے اجازت مل گئی۔ اور استغفار کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی: "مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ يَسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْا أُوْلِيْ قُرْبٰى". الآية.

اس سے بھی عجیب تر بات حافظ ابن حجر نے کہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

شاید ان کے لیے استغفار کی اجازت نہ دیے جانے کی حکمت آپ ﷺ پر اتمام نعمت ہو۔ بایں طور کہ بعد میں ان کو آپ ﷺ کے لیے زندہ کر دیا گیا، تاکہ ان کا شمار بڑے مؤمنین میں ہو۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ: ان کے زندہ کیے جانے کے بعد ایمان لانے کے وقت تک استغفار سے منع کیا گیا ہو۔ اور یہ اس لیے تاکہ تب وہ کامل استغفار کی حق دار ہو جائیں۔

اس میں یہ نکتہ ہے کہ: ایمان سے پہلے مطلقاً کسی کے لیے بھی استغفار کرنا جائز نہیں ہے۔ پھر جمہور کا کہنا یہی ہے کہ: آپ ﷺ کے والدین کی وفات کفر کی حالت میں ہی ہوئی ہے۔ اور ان دونوں کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں، ان میں زیادہ صحیح روایت یہی ہے۔

اور باقی رہا ابن حجر کا گذشتہ قول کہ: ''ان کو زندہ کر دیا گیا تھا تاکہ وہ ایمان لے آئیں، اور پھر دوبارہ ان کی وفات ہوئی''، تو یہ بھی صحیح ہے۔ اور اس کی تصحیح کرنے والوں میں امام قرطبی اور حافظ ابن ناصر الدین آتے ہیں۔

اور اگر اس کی صحت تسلیم کر لی جائے تو بھی وہ مسلم کی روایت کے معارض نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ حفاظ نے ایک تو اس (کی سند) پر طعن کیا ہے، اور اس بات کو بھی اجماعی طور پر جائز نہیں سمجھا کہ ایمانِ یأس مقبول ہو۔ (ایمانِ یأس کا لفظی معنی ہے: خوف کا ایمان۔ اور یہاں یہ مراد ہے کہ جس نے آخرت کے احوال کا مشاہدہ کر لیا ہو، اس کا ایمان مقبول نہیں ہے)، جیسا کہ اس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ مکلف شخص کا جو ایمان مطلوب ہے، وہ تو مغیبات پر ایمان ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ". کہ: اگر انہیں واپس دنیا میں بھیج دیا گیا، تو وہ دوبارہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا ہے۔

یہ صحیح اور صریح حدیث اس موقف کو بھی کلیتاً رد کرتی ہے جسے بعض لوگوں نے باوجود مختلف فیہ ہونے کے اختیار کیا ہے کہ: ''وہ دونوں اہل فترت میں سے تھے، اور انہیں کوئی عذاب نہ ہوگا''۔ اور امام سیوطی رحمہ اللہ نے آپ ﷺ کے والدین کی نجات کے بارے میں تین رسالے لکھے ہیں، اور جانبین کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔ اگر تفصیل چاہتے ہو تو ان رسائل کو دیکھو۔ (۶۹)

---

۶۹ : مرقاة المفاتيح ٢ : ٤٠٦.

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملا علی قاری اس بارے میں ابتداءً اتنے متشدد نہ تھے۔ لیکن بعد میں حد سے زیادہ شدت میں آ گئے، چنانچہ "شَرْحُ الفِقْهِ الأكبر" میں کہتے ہیں:

''رسول اکرم ﷺ کے والدین کی وفات کفر پر ہوئی۔ اور اس میں ان لوگوں کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ: ان دونوں کی وفات ایمان پر ہوئی ہے۔ یا یہ کہا ہے کہ: ان کی وفات تو کفر پر ہوئی تھی، لیکن ان دونوں کو اللہ تعالی نے زندہ فرمایا، اور پھر ایمان وایقان کے ساتھ ہی ان کی وفات ہوئی۔ میں نے اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنے تین رسالوں میں اس مقالے کی وکالت میں جو کچھ ذکر کیا ہے، کتاب وسنت، قیاس اور اجماع امت کے جامع دلائل سے ان کا رد کیا ہے۔

اور عجیب وغریب بات تو اس قضیہ میں یہ ہے کہ: بعض لاعلم حنفیہ نے بھی اس مسئلہ کی تفصیلی ابحاث کے باوجود اس قضیہ (یعنی والدین مکرمین کی کفر پر وفات) کا انکار کیا ہے۔ بلکہ اس طرف اشارہ کیا ہے کہ: ایسی بات کہنا امام اعظم رحمہ اللہ کی شان کے لائق نہیں ہے۔ اور یہ بعینہ ویسی ہی بات ہے جو گمراہ جہم بن صفوان نے کہی ہے کہ: میں چاہتا ہوں کہ قرآن مجید سے اس آیت: "ثُمَّ اسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ" کو مٹا دوں۔ اور ایک دوسرے گمراہ احمد بن داود قاضی کی بات جیسی بات ہے کہ جس نے خلیفہ مامون کو یہ کہا تھا کہ: خانہ کعبہ کے پردوں پر یہ لکھوا دو: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ"۔ اور اس بڑے رافضی کی کہی ہوئی بات جیسی بات ہے جس نے کہا تھا کہ: وہ قرآن مجید کے ایسے نسخے سے بری ہے جس میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تعریف بیان ہوئی ہو۔ (۷۰)

ملا علی قاری نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ میں یہ کہا ہے:

میرے بعض مخلص اور قریبی ساتھیوں نے مجھ سے یہ کہا کہ: میں معتبر ترین امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بیان کردہ مسئلے کی وضاحت میں ایک رسالہ لکھوں جسے انہوں نے اپنی کتاب "الفقهُ الأكبر" کے آخر میں ذکر کیا ہے اور اسی پر اکثر لوگوں کے عقائد کا مدار ہے۔ اور اس مسئلہ میں امام اعظم رحمہ اللہ کی مخالفت علامہ جلال الدین سیوطی اور امام شافعی کے متبعین کی ایک بڑی جماعت نے کی ہے۔ اور بعض حنفی علماء وفضلاء نے بھی انہی کی تقلید میں اس بات کو اختیار کر لیا ہے۔

میں ان ساتھیوں کی بات پر متردد رہا کہ ان کی بات مانوں یا انکار کر دوں، چنانچہ میں کسی اور فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے اور کسی بڑی مصیبت میں پڑ جانے کے خوف سے ایک قدم بڑھاتا، اور دوسرا پیچھے کر لیتا تھا۔ لیکن پھر میں نے اپنے رب پر توکل کرتے ہوئے: "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" کہہ کر کام شروع کر دیا۔ چنانچہ میں نے تمام بندوں کے رب کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے، آپ ﷺ کے آباء واجداد کے اعتقاد کے بارے میں یہ کتاب لکھنی شروع کی ہے۔ رحیم وکریم اللہ سے ہی سیدھے راستے، اور ٹھیک راہ پر ثابت قدم رہنے کی توفیق چاہتا ہوں۔ وہی ہے جو کریم ہے، سخی ہے، بندوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہے، اور لوگوں پر رحم کرتا ہے۔

ملا علی قاری نے اس بحث میں خطا یہاں کی کہ: انہوں نے اپنی شرح کی بنیاد "الفقه الأكبر" کے ایک محرّف نسخہ پر رکھی۔ چنانچہ محدث ناقد شیخ محمد زاہد الکوثری (ت ۱۳۷۱ھ) نے کتاب: "العالِم والمتعلِّم" کے مقدمے میں یہ بات ذکر کی ہے کہ:

---

۷۰ : شرح فقه أكبر: ص ۱۳۰، المطبع المجتبائية دهلي، ۱۳۱٤ هج.

"الفقه الأكبر" کا وہ نسخہ جس کی روایت: حماد بن ابی حنیفہ نے، اپنے والد صاحب (یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) سے کی ہے، اس کی بہت سی شروح ہیں۔اور کئی ملکوں میں خود یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، جیسا کہ اس کی کئی ایک شروح بھی چھپ چکی ہیں۔اور اس کتاب کی سند کا ذکر اس خطی نسخے میں ہے جو مدینہ منورہ (اللہ تعالی اس کی قدر و منزلت میں اور زیادتی کرے) میں شیخ الاسلام عارف حکمت کے کتب خانے میں (۲۲۶) نمبر پر موجود مجموعہء کتب کے ضمن میں ہے۔اس نسخے کے شروع میں سند کا بیان یوں ہے:

سندُ الشَّيخ إبراهيم الكوراني في الكتاب إلىٰ عليّ بنِ أحمدَ الفارسيِّ عن نصير بن يحيىٰ عن ابن مقاتِلٍ (محمَّد بنِ مقاتِلٍ الرَّازيِّ) عن عصام بن يُوسُفَ عن حمَّاد بنِ أبِي حنيفةَ - رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الجَمِيعِ.

یعنی: اس کتاب میں ابراہیم کورانی کی سند یوں ہے کہ: انہوں نے علی بن احمد فارسی سے، انہوں نے نصیر بن یحییٰ سے، انہوں نے محمد بن مقاتل رازی سے، انہوں نے عصام بن یوسف سے، اور انہوں نے حماد بن ابی حنیفہ سے روایت کی ہے۔(اللہ ان سب سے راضی ہو)۔

شیخ الاسلام کے اس کتب خانے میں حماد کی روایت کے دو قدیم اور صحیح نسخے موجود ہیں۔اے کاش! کہ کوئی علم کا جویا "الفقه الأكبر" کے ان دو نسخوں کو سامنے رکھ کر، اور "دارُ الكتُبِ المِصْرِيَّة" والے نسخے سے مقابلہ کر کے نئے سرے سے طبع کرے۔

اس کتاب کے بعض نسخوں میں عبارت یوں ہے:

"وَأَبَوَا النَّبِيِّ ﷺ مَاتَا عَلىٰ الفِطْرَةِ. وَ"الْفِطْرَةُ" سَهلَةُ التَّحريفِ إِلىٰ الْكُفرِ" في الخَطِّ الكُوفِيِّ. یعنی:
نبی اکرم ﷺ کے والدین کی وفات فطرت پر ہوئی۔اور فطرت ایسا لفظ ہے کہ خط کوفی میں اس کی تحریف ہو کر کفر بن جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

اور اکثر نسخوں میں عبارت یوں ہے: "مَاتَا عَلىٰ الْكُفرِ". کہ: ان دونوں کی وفات کفر پر ہوئی۔

امام اعظم رحمہ اللہ اس مقام پر ان لوگوں کا رد فرما رہے ہیں جو اس حدیث: "أَبِيْ وَأَبُوْكَ فِي النَّارِ" کو روایت کر کے، یہ نظریہ قائم کیے ہوئے ہیں کہ: "وہ اہلِ جہنم میں سے ہیں"۔ کیونکہ کسی شخص کے لیے جہنم کا حکم کسی یقینی دلیل ہی کی وجہ سے تو ہوتا ہے۔اور میرا موضوع اس عنوان پر کام کرنا نہیں ہے، کہ اس میں دلیل ظنی چل سکے"۔

شارح "إحياء العلوم" اور صاحب "القاموس": حافظ محمد مرتضی زبیدی، اپنے: "الانتِصَار، لِوَالِدَي النَّبِيِّ المُخْتَار" نامی رسالے میں، (میں نے ان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ رسالہ معمر عالم مفتی عسکر شیخ احمد بن مصطفیٰ عمری حلبی کے ہاں دیکھا تھا) کہتے ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ: جب ناسخ نے کتاب کی عبارت "مَا مَاتَا" میں لفظ: "ما" کا تکرار دیکھا تو خیال کیا کہ ان میں سے ایک "ما" زائدہ ہے، چنانچہ اس نے ایک "ما" کو حذف کر دیا، اور اس طرح یہ غلط نسخہ فروغ پا گیا۔اور اس کی دلیل اس خبر کا سیاق و سباق ہے۔اس لیے کہ ابو طالب اور والدین مکرمین، سبھی کی ایک سی حالت ہوتی، تو تینوں کو ایک حکم میں ایک ہی جملے میں جمع کر دیتے، نہ یہ کہ دو جملے بنائے جاتے۔خصوصاً جب کہ مقصود بھی سب کا ایک ہی حکم بیان کرنا ہو۔

حافظ زبیدی کی یہ رائے بہت وزنی ہے، مگر انہوں نے "اَلْفِقْهُ الْأَكْبَر" کا کوئی ایسا نسخہ دیکھا نہیں تھا جس کی عبارت میں "مَا مَاتَا" کا لفظ ہو۔ اور انہوں نے یہ حکایت ایسے شخص سے کی ہے جس نے ایسا نسخہ دیکھا تھا۔ اور اللہ کا شکر اور اسی کی حمد وتعریف ہے کہ میں نے "دَارُ الْكُتُبِ الْمِصْرِيَّة" کے دو قدیم نسخوں میں: "مَا مَاتَا" کا لفظ خود دیکھا ہے، جیسا کہ میرے بعض دوستوں نے "مَا مَاتَا" اور "عَلىٰ الْفِطْرَةِ" کے دونوں لفظ شیخ الاسلام عارف حکمت کے مکتبہ کے دونوں نسخوں میں دیکھے ہیں۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اپنی شرح کی بنیاد کسی خطا والے نسخے پر رکھ لی، اور سوءِ ادب کا شکار ہو گئے۔ اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے۔ (۷۱)

آپ کے انہی تسامحات کے بارے میں محبی نے کہا ہے کہ: اگر اُن سے اِن مسامحات کا صدور نہ ہوتا تو ان کی کتابیں کثرت فوائد اور حسنِ عبارت کی وجہ سے مشہور ہو کر پوری دنیا میں پھیل جاتیں۔

بالجملہ، موصوف ان علما میں سے تھے جنہوں نے سنت کی حمایت، بدعت کا قلع قمع کرنے، اور علوم ظاہرہ وباطنہ کی نشر واشاعت میں زندگی کھپادی۔ اور ان کی ذات سے عام نفع ہوا۔ اور لوگوں کو ان کی کتابوں کی احتیاج بہت زیادہ رہی ہے۔ اسی وجہ سے محدث مؤرخین نے انہیں گیارہویں صدی کا مجدد قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ فقیہ محدث شیخ محمد عبد الحئ لکھنوی اپنے فتاوی میں نقل کرتے ہیں:

"جو شخص بھی "خُلَاصَةُ الْأَثَرِ فِي أَعْيَانِ الْقَرْنِ الحَادِي عَشَر" کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ شیخ شہاب الدین رملی اور ملا علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ، مجددین میں سے تھے"۔ (۷۲)

ایسے ہی اپنی کتاب: "التَّعْلِيقَاتُ السَّنِيَّة" میں رقم طراز ہیں:

"میں نے ان کی مذکورہ سبھی کتب کا مطالعہ کیا ہے ....، انتہائی مفید کتب ہیں۔ اور ایک ہزار سال کے سرے پر ان کتابوں نے انہیں مجددیت کے درجے تک پہنچا دیا ہے"۔ (۷۳)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ: آپ قرن عاشر کے مجددین (۷۴) میں سے تھے۔ آپ نے علم تفسیر وقراءات، اور حدیث وفقہ

---

۷۱ : العالم والمتعلّم ص ٦، بتحقيق الشيخ محمد زاهد الكوثري، مطبعة الأنوار، القاهرة ١٣٦٨ هج.

۷۲ : جس کی فارسی عبارت یہ ہے:

از معائنۂ خلاصة الأثر في أعيان قرن الحادي عشر وغيره واضح است كه از مجددين ألف شهاب الدين رملي وملا علي قاري وغيره بودند.

مجموعة الفتاوى ١ : ٦٧، مطبع يوسفي، لكهنئو ١٣٤٤هج.

۷۳ : دیکھئے: الفوائد البهية مع التعليقات السنية ص ٩، طبع مصر ١٣٢٤.

۷۴ : علماء شافعیہ تو اس معاملے میں حد سے ہی تجاوز کر گئے ہیں، چنانچہ انہوں نے مجددین کی فہرست کو شوافع ہی میں محصور کر دیا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے کا ذکر کیا ہے تو بس قسم توڑنے کے سے انداز میں کیا ہے، جیسا کہ حافظ سیوطی کے اس ارجوزہ سے واضح ہے جس کا نام انہوں نے "تحفة المهتدين بأخبار المجددين" رکھا ہے، اور مؤرخ محبی نے اپنی کتاب "خلاصة الأثر" (٢: ٣٤٤ - ٣٤٥) میں اسے من وعن مکمل نقل کر دیا ہے۔ مزید شیخ محمد عبد الرؤوف مناوی نے اپنی کتاب "فيض القدير في شرح الجامع الصغير" (٣: ٢٨٧) میں نقل کیا ہے۔ یہاں ہم .....

......وہ ارجوزہ خلاصۃ الاثر سے نقل کررہے ہیں:

الحمد لله العظيم المنة ... المانح الفضل لأهل السنة
ثم الصلاة والسلام نلتمس ... على نبي دينه لا يندرس
لقد أتى في خبر مشتهر ... رواه كل حافظ معتبر
بانه في رأس كل مئة ... يبعث ربنا لهذه الأمة
منا عليها عالما يجدد ... دين الهدى لأنه مجدد
فكان عند المئة الأولى عمر ... خليفة العدل بإجماع وقر
والشافعي كان عند الثانية ... لما له من العلوم السارية
وابن سريج ثالث الأئمة ... والأشعري عده من أمه
والباقلاني رابع أو سهل أو ... الإسفرايني خلف قد حكوا
والخامس الحبر هو الغزالي ... وعده ما فيه من جدال
والسادس الفخر الإمام الرازي ... والرافعي مثله بوازي
والسابع الراقي إلى المراقي ... ابن دقيق العيد باتفاق
والثامن الحبر هو البلقيني ... أو حافظ الأنام زين الدين
وعد سبط الميلق الصوفية ... لو وجدت مائته وفيه
والشرط في ذلك أن تمضي المئة ... وهو على حياته بين الفئة
يشار بالعلم إلى مقامه ... وينصر السنة في كلامه
وأن يكون جامعا لكل فن ... وأن يعم علمه أهل الزمن
وأن يكون في حديث قد روى ... من آل بيت المصطفى وهو قوى
وكونه فردا هو المشهور ... قد نطق الحديث والجمهور
وهذه تاسعة المئين قد ... أتت ولا يخلف ما الهادي وعد
وقد رجوت أنني المجدد ... فيها ففضل الله ليس يجحد
وآخر المئين فيها يأتي ... عيسىٰ نبي الله ذو الآيات
يجدد الدين لهذى الأمة ... وفي الصلاة بعضنا قدامه
مقررا لشرعنا ويحكم ... بحكمنا وفي السماء يعلم
وبعده لم يبق من مجدد ... ويرفع القرآن مثل ما بدى
وتكثر الأشرار والأضاعه ... من رفعه إلى قيام الساعة
وأحمد الله على ما علما ... وما جلا من الخفا والغما
مصليا على نبي الرحمة ... والآل ما أصحابه المكرمه

وغیرہ کو بایں طور زندہ کیا کہ ان علوم کو جمع کیا، اور اپنی مشہور و مقبول کتب میں ان کی شروح لکھیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ متقدّم مجتہدین کے پائے کے تھے، جیسا کہ ملا علی قاری نے خود، رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث: "إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ، عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِئَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا" کی شرح کرتے ہوئے کہا ہے:

(ان اشعار کا ترجمہ کرنے کی بجائے انہیں بعینہ ویسے ہی نقل کر دیا گیا ہے، جیسے استاذِ محترم ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی صاحب نے نقل کیا تھا)۔

"مَنْ يُجَدِّدُ": یعنی جو تجدید کرے گا: سے مراد کوئی ایک شخص نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ایک ایسی جماعت ہے، جن میں سے ہر شخص کسی علاقے یا ملک میں مہیا شدہ اسباب وعوامل کی بنا پر علوم شرعیہ کے کسی ایک فن، یا کئی ایک فنون کی تجدید کرے گا۔ خواہ وہ تقریر کے ذریعہ ہو، خواہ تحریر کے ذریعہ سے۔ اور ہر ایسے شخص کی یہ خدمات اس کی بقاء، نام نہ مٹنے اور یادگار رہنے کا سبب بن جایا کرتی ہیں، حتّٰی کہ اللہ کا اَمر آ جائے، (یعنی قیامت آ جائے)۔

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تجدید کی یہ صفت ایک امر اضافی ہے۔ کیونکہ علم میں تنزّل ایسے ہی روز افزوں ہے جیسے کہ جہل میں ترقی۔ اور ہمارے آج کے اس دور کے علماء کی ترقی کا سبب اس زمانے میں علم کا تنزّل ہی تو ہے۔ ورنہ عصر نبوی ﷺ سے بُعد اور دُوری کو دیکھیں تو عمل وعمل، حلم وفضل، تحقیق وتدقیق میں کہاں متقدمین کا درجہ، اور کہاں متاخرین (اور خصوصاً ہمارے زمانہ کا علم)۔ بالکل ایسے ہی جیسے نور کے منبع اور مرکز سے دور ہوتے جائیں تو ظلمت بڑھتی جاتی ہے، اور حقیقت کا ظہور ماند پڑتا جاتا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں اس کی طرف بڑا واضح اشارہ ہے کہ: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَا يَأْتِيْ عَلٰى أُمَّتِيْ زَمَانٌ إِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهُ شَرٌّ مِنْهُ". کہ میری امت پر جو زمانہ بھی آئے گا، اس کے بعد والا اس سے بھی زیادہ شر والا ہوگا۔

اور معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "مَا مِنْ عَامٍ، إِلَّا وَيُحْدِثُ النَّاسُ بِدْعَةً، وَيُمِيْتُوْنَ سُنَّةً، حَتّٰى تُمَاتُ السُّنَنُ وَتُحْيَا الْبِدَعُ"، کہ ہر آنے والے نئے سال میں، لوگ بدعتیں ایجاد کرتے رہیں گے، اور سنتوں کا جنازہ نکالتے رہیں گے، حتی کہ سنتیں مردہ ہو جائیں گی اور بدعتیں زندہ ہو جائیں گی۔

اور یہ جو تھوڑا بہت اثر نظر آتا ہے، یہ بھی متقدّمین کے علوم وبرکات کا اثر ہے۔ لہٰذا، ہماری ذمہ دار ہے کہ ہم اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کریں کہ: اُولویّت وفضیلت متقدّمین ہی کو حاصل ہے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔ (۷۵)

بالجملہ، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف علاقوں میں علمِ دین میں مشغول طلبہ کے لیے ملا علی قاری کی قابل قدر خدمات ہیں۔ اور ملّا علی قاری کے کام کا زیادہ تر حصہ تلخیص وتجرید، اور خوب صورت انداز میں شرح کرنا ہے۔ اور ان کی محنت کا بنیادی نکتہ اور انتہائی دائرہ کار یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عمر (متقدمین کے علوم وفنون کی) تائید وتاکید میں گزار دی۔ اور متقدمین ومتاخرین کے عمل میں یہی فرق ہے، جیسا کہ ملا علی قاری نے خود قاضی ابو الخیر ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی (ت ۶۵۸ھ) کا قول متقدّمین ومتأخرین کے مزایا اور اسلوب کے بیان میں نقل کیا ہے، کہ انہوں نے کہا:

۷۵: دیکھئے: مرقاة المفاتيح ۱: ۲۴۸، طبع مصر.

''متقدمین نے اساس قائم کی اور (اساسی اینٹ رکھنے کے بعد) تمہیدی قواعد بیان کر کے راہ دکھائی۔ اور متاخرین نے ان کی تلخیص وتجرید کی، اور اپنی زندگیوں کو انہی علوم وفنون کی تائید وتاکید میں کھپا دیا۔ (۷۶)

مناسب ہے کہ اس مقام پر ہم ایک ضروری نکتے پر متنبہ کر دیں۔ اور وہ یہ کہ فقہ الحدیث ایک گہرا علم ہے۔ اس علم کی طرف توجہ دینے والے اور اس کے ماہر، متقدمین ہوں یا متاخرین، بہت ہی تھوڑے رہے ہیں۔ اور ملا علی قاری رحمہ اللہ کو اگر ان میں شمار کیا جاتا ہے، تو ان کے فخر کے لیے تو یہی بس ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''عجالۂ نافعہ'' میں رقم طراز ہیں:

''علم حدیث کا تعلق: خبری علم سے ہے۔ اور خبر میں سچ اور جھوٹ، دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ تو اس علم کو حاصل کرنے والے کے لیے دو باتوں میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے:

۱ : راویوں کے حالات کی چھان بین

۲ : احادیث کے سمجھنے میں انتہائی احتیاط کرنا۔

اس لیے کہ پہلی بات میں سستی کی وجہ سے سچا اور جھوٹا خلط ملط ہو جائے گا۔ اور دوسری بات میں احتیاط نہ کرنے سے جو مراد نہ ہو، اسے مراد سمجھ لیے جانے کا اشتباہ ہو سکتا ہے۔ اور دونوں ہی صورتوں میں علم حدیث کا وہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا جس کی امید پر یہ علم حاصل کیا جاتا ہے۔ بلکہ بالعکس اس کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے، اور ضَلَال و اِضلَال (یعنی گمراہی، اور گمراہ کرنا) سامنے آتا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس سے بچائے۔

اور پہلی بات: یعنی حدیث روایت کرنے والے راویوں کے حالات کی چھان بین کا صدر اول میں، تابعین اور تبع تابعین سے لے کر امام بخاری ومسلم کے زمانے تک طریقہ اور تھا۔ چنانچہ وہ ہر علاقے اور زمانے کے رجال کے حالات سے بحث کرتے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتے تھے۔ اور جب کبھی ان میں سے کسی سے بھی جھوٹ کی، یا سوءِ حفظ اور بے دینی کی بو محسوس کرتے، تو اس کی حدیث کو قبول نہ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے رجال کے احوال میں بڑی تفصیلی کتب لکھی گئیں۔

رہی بات آج کل کے حالات کی، تو اس کا طریق کار دوسرا ہے۔ اسی وجہ سے اب تو قابلِ اعتماد اور صرف صحیح روایات بیان کرنے والی کتب کی ان کتابوں سے تمیز ضروری ہوگئی ہے جن کو رد کرنا اور چھوڑنا واجب ہو گیا ہے۔ اور یہ اس لیے تاکہ طالب علم ورطۂ حیرت وتخلیط میں نہ پڑ جائے۔ اور بہت سے متاخر محدثین سے کتابوں کی یہ تمیز اور فرق اور ان کی رعایت رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے رسائل میں جمہور سلف صالحین کی مخالفت کی ہے۔ اور ایسی کتب سے تمسک واستدلال کیا ہے جن کا ماہر محققین کے ہاں کوئی اعتبار ہی نہیں ہے۔

اور جہاں تک دوسری بات، یعنی احادیث کے معانی سمجھنے میں احتیاط برتنے کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں قاضی عیاض کی ''مَشَارِق

---

۷۶ : دیکھئے: مرقاۃ المفاتیح ۵ : ٦٥٧.

"الأنوار (۷۷) صحيحين (یعنی بخاری ومسلم) اور "موطأ الإمام مالك" کے معانی کی توضیح وتشریح کے لیے کافی ہے۔ اور ابن اثیر کی "جَامِعُ الأُصُول" (۷۸) چھے بنیادی کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے۔ اور "مَجْمَعُ البِحَار" (۷۹) مذکورہ چاروں طبقات کی تمام کتب حدیث کی تحقیق سے مستغنی کر دیتی ہے۔

---

۷۷ : قاضی القضاۃ برہان الدین ابن فرحون مالکی (ت ۷۹۹ھ) نے اپنی کتاب: "الديباج المذهب في معرفة أعيان علماء المذاهب" (صفحة ۱۷۰، مصر، ۱۳۵۱هج) میں قاضی عیاض کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''کتاب "مشارقُ الأنوار" موطأ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کے غریب الفاظ کی تفسیر، الفاظ کے ضبط، اوہام وتصحیفات کے مقامات پر تنبیہ، اور اسماء رجال کے ضبط کے بیان میں لکھی جانے والی کتاب ہے۔ اور یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر سونے کے پانی سے لکھی جائے، یا جواہرات سے تولی جائے، تو اس کے حق کی ادائیگی کے مقابلے میں پھر بھی کم ہے۔ کسی نے اس کے بارے میں یہ شعر کہے ہیں:

مَشَارِقُ الأنْوَارِ تَبَدَّتْ بسبته ومِن عَجَبٍ كونُ المَشَارِقِ بالغَرْبِ

کہ: مشارق الأنوار ایک عرصے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور تعجب تو اس بات پر ہے کہ مشارق کا ظہور مغرب میں ہوا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب دو مرتبہ طبع ہو چکی ہے۔ ایک مرتبہ تو فاس میں، اور دوسری مرتبہ مصر میں طبع ہوئی تھی۔

۷۸ : یاقوت بن عبداللہ حموی رومی (ت ۶۲۶ھ) نے اپنی کتاب "معجم الأدباء" (۲٤۱:٦، القاهرة ۱۹۲۳م) میں ابن اثیر جزری شافعی (۶۰۶ھ) کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

کتاب: "جامع الأصول في أحاديث الرسول" دس جلدوں میں ہے، جس میں آپ نے بخاری، مسلم، موطأ، سنن ابی داود، سنن نسائی اور سنن ترمذی کو حروفِ معجم کی ترتیب پر جمع کیا ہے، اور غریب الاحادیث اور اس کے معانی کی شرح، اور اس کے احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کے رجال کے اوصاف کو بیان کیا ہے۔ اور مزید جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے، ان پر تنبیہ بھی کی ہے۔

مؤلف کا کہنا ہے: میں پورے وثوق اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ: اس جیسی کتاب کبھی بھی تصنیف نہیں کی گئی، اور نہ ہی کی جا سکے گی۔ جامع الأصول مصر سے چھپ چکی ہے۔

۷۹ : شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے رسالہ 'عجالۂ نافعہ' میں اس کے بارے میں کہا ہے:

شیخ محمد طاہر گجراتی کی ''مجمع البحار'' غریب الفاظ کی شرح اور ان کی عبارات کی توجیہ کی وجہ سے ہر قسم کے مواد سے مستغنی کر دیتی ہے۔ (دیکھیں: الحطۃ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۵۸)

سید عبدالحی حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٤ : ۳۰۱) میں شیخ محمد بن طاہر پٹنی (ت ۹۸۶ھ) کے حالات میں کہا ہے:

آپ کی کئی جلیل القدر تصنیفات ہیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور اور بہترین کتاب: "مجمع بحار الأنوار في غَرائبِ التَّنْزِيلِ ولَطَائِفِ الأخبَار" ہے۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں تمام غریب الحدیث اور اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتب کے مواد کو جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب اس کی حیثیت صحاح ستہ کی شرح کی ہو گئی ہے۔ موصوف کی یہ کتاب ایسی ہے کہ لکھے جانے کے وقت ہی سے اہلِ علم کے ہاں متفق علیہ طور پر اسے قبول کر لیا گیا ہے، اور علامہ طاہر پٹنی نے اس عمل سے اہلِ علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔......

علامہ سیوطی کی "الجَامِعُ الصَّغِير" پر شیخ عبدالرؤف مناوی کی شرح اکثر احادیث کی تشریح کے لیے کافی وافی ہے۔ لیکن احادیث

کی شرح میں شراح کا کلام بہت متنوع ہے، اور ان کی توجیہات میں بہت سارطب و یابس بھی راہ پا گیا ہے۔ لہٰذا طالب علم کے لیے ان رجال کی معرفت بہت ضروری ہے جن پر احادیث کی تشریح کرنے کے باب میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ مزید برآں ان تالیفات کی پہچان بھی بہت ضروری ہے جن پر یقین و اعتبار کیا جاتا ہے، اور ایسے معتمد علماء میں سے صحیح مسلم کے شارح امام نووی (۸۰) اور بغوی ہیں۔ علامہ بغوی کی کتاب "شَرْحُ السُّنَّة" (۸۱) فقہ الحدیث اور اس کی مشکلات کی توجیہ کے بارے میں کافی ہے، اور یہ ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ: اس کے ذریعے "مَصَابِيح" اور "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيح" دونوں ہی کی شرح ہو جاتی ہے۔ اور ایسے ہی ان میں سے "سُنَن أَبِي دَاود" کے شارح علامہ خطابی (۸۲) ہیں۔ یاد رہے یہ تمام علماء مسلکاً شافعی ہیں۔

...... سید صدیق حسن خان قنوجی اپنی کتاب "أبجد العلوم" (۸۹٦:۳) میں رقم طراز ہیں:

آپ کی کتاب "مجمع البحار" کچھ عرصہ پہلے ہی ہندوستان میں طبع ہوئی ہے، اور نصف النہار میں سورج کے چمکنے کی طرح مشہور ہو گئی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس میں مؤلف نے ہر غریب الحدیث اور اس موضوع پر لکھی جانے والی تمام کتب کو سمیٹ لیا ہے۔ لہٰذا، اب یہ صحاح ستہ کی شرح کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اگر کسی کے پاس اُمہاتِ ستہ میں سے کسی کتاب کی شرح نہ ہو، تو معانی کے حل، اور پیچیدگیوں کی وضاحت کیلئے یہی ایک کتاب کافی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کے مقبول ہونے پر اتفاق ہے، اور پردۂ ظہور میں آنے کے بعد سے، اہلِ علم کے ہاں متداول ہے۔ و باللّٰہِ التَّوفِيق.

۸۰ : علامہ شرف الدین طیبی نے اپنی کتاب "الكاشف عن حقائق السنن" میں امام مسلم بن حجاج کی کتاب "الصحيح" کی امام نووی کی "المنهاج" نامی شرح کی انتہائی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

"میرا زیادہ تر اعتماد، اور انتہائی اہتمام امام نووی کی شرح مسلم کی طرف مراجعت کا رہا ہے، اس لیے کہ وہ فوائد کی جامع ترین، اور کثیر نکات سے پُر ہے"۔

۸۱ : محی السنۃ حسین بن مسعود بغوی نے اپنی مشہور کتاب "شرحُ السُّنَّة" کے مقدمے میں کہا ہے:

"یہ کتاب نبی اکرم ﷺ سے مروی احادیث کے علوم، اور اخبار کے بہت سے فوائد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس میں مشکلات حدیث کا حل، غریب الحدیث کی تفسیر، اس کے احکام کا بیان، اس پر مترتب ہونے والے فقہی مسائل اور اختلاف علماء کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایسے کئی دوسرے امور کو بھی بیان کیا گیا ہے جن سے مستغنی نہیں رہا جاسکتا۔ احکام میں اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ میں نے اس میں صرف وہی کچھ نقل کیا ہے جو اہل سنت علماء کے ہاں مسلّم ہے اور اس پر ائمۂ سلف نے اعتماد کیا ہے، اور ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ باقی وہ باتیں جن کا شمار مقلوب، موضوع یا مجہول چیزوں میں ہوتا ہے اور ان کے چھوڑنے پر اکابرینِ امت کا اتفاق ہے، میں نے اس کتاب کو ان سے پاک رکھا ہے"۔

حکیم الامت علامہ محدث فقیہ شاہ ولی اللہ دہلوی نے موطأ امام مالک کی فارسی زبان میں جو شرح لکھی ہے اس میں "شرحُ السُّنَّة" پر اعتماد کیا ہے۔ ہم نے "شرحُ السُّنَّة" کا کچھ حصہ علامہ محدث، محقق بارع، شیخ مفضال محمد یوسف بنوری کے پاس دیکھا اور اس کا مطالعہ کیا ہے۔

۸۲ : یاقوت رومی نے اپنی مشہور کتاب "معجم الأدباء" میں امام حسن بن محمد صغانی لاہوری (ت ٦٥٠ھ) کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"عدن میں آپ کے سامنے خطابی کی "معالمُ السُّنَن" پڑھی گئی۔ آپ کو یہ کتاب اور اس کے مصنف کا کلام بہت بھایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے: "خطابی نے تو اس کتاب میں سبھی کچھ سمیٹ لیا ہے"۔

احادیث کی شرح کرنے والے معتبر علماء میں سے ایک امام طحاوی (۸۳) بھی ہیں۔ ان کی کتاب "معاني الآثار" سے ہی حنفیہ

۸۳: امام طحاوی ان ائمہ میں سے ہیں جو فقہ وحدیث کے جامع تھے۔ اور یہ اتنی واضح بات ہے کہ معاند کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ میرے بڑے بھائی ماہر و باکمال محدث، محقق مفضال شیخ محمد عبدالرشید نعمانی نے اپنی کتاب "ما تمسُّ إليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجه" (ص ۲۹، طبع کراچی) میں کہا ہے:

''علامہ محدث، فقیہ، اصولی امیر کاتب عمید اتقانی ہدایہ کی شرح "غاية البيان" میں، امام طحاوی کی "معاني الآثار" کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میں کہتا ہوں: ابو جعفر طحاوی کے علم وفضل کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی غزارتِ علمی، ورع وتقویٰ، اور فقہی مذاہب کی معرفت کی شہرت کے ساتھ ساتھ امانت داری میں بھی مشہور ہیں، اور انہیں متہم نہیں سمجھا گیا۔ خود ہی "شرح معاني الآثار" کو دیکھ لیجیے۔ ہمارے مذہب کو تو چھوڑیے، بھلا اس کے علاوہ باقی مذاہب میں بھی کہیں اس کی نظیر ملتی ہے؟

حافظِ مغرب، اہلِ ظاہر کے امام شیخ ابن حزم ظاہری کا طرزِ عمل بہت ہی منصفانہ ہے، چنانچہ انہوں نے صحیحین کے ساتھ امام نسائی اور امام ابو داود کی کتاب کا ذکر کرنے کے بعد امام طحاوی کا بھی ذکر کیا ہے۔

حافظ ذہبی "سیَر أعلام النُبلاء" میں آپ کے ترجمہ میں یہ بات نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

میں نے انہیں اس موقف کے قائلین کا ہم نوا پایا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: حدیث کی تصنیفات میں سب سے جلیل القدر تصنیف موطأ امام مالک ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

صحتِ حدیث کے اعتبار سے سب سے زیادہ قابلِ تعظیم کتب (بالترتیب) صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن سکن، منتقیٰ ابنِ جارود، منتقیٰ قاسم بن اصبغ ہیں۔ ان کے بعد امام ابوداود، اور امام نسائی کی کتب، مصنَّف قاسم بن اصبغ اور مصنَّف ابی جعفر طحاوی ہیں۔

علامہ ذہبی کہتے ہیں: ابنِ حزم نے سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی میں سے کسی کا بھی تذکرہ نہیں کیا، کیونکہ انہوں نے ان میں سے کوئی ایک بھی نہیں دیکھی۔ اور یہ دونوں کتابیں آپ کی وفات کے بعد اندلس پہنچی ہیں''۔ انتہی۔

حافظ علامہ بدرالدین عینی اپنی کتاب "نُخبُ الأفكار في شرح معاني الآثار" میں رقم طراز ہیں:

''علمِ حدیث اور تاریخ کا ماہر، ہر وہ شخص جس نے آپ کا تذکرہ کیا ہے، اس نے آپ کی اس کتاب کی تعریف ہے، جیسے طبرانی، ابوعبداللہ حمیدی، اور حافظ ابن عساکر، اور ان کے علاوہ دوسرے متقدمین ومتاخرین جیسے حافظ ابو الحجاج مزی، حافظ ذہبی، عماد الدین ابن کثیر، اور ان کے علاوہ دوسرے اصحابِ تصانیف۔

اور اس بات میں کسی عاقل اور منصف شخص کو شک نہیں ہو سکتا کہ امام طحاوی نے قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے احکام کے مسائل کے استنباط کے عمل کو بڑے واضح انداز میں پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ اور اپنے ہم عمر معاصرین، اور اصحابِ صحاح وسنن سے روایتِ حدیث کرنے میں اپنے شریکِ درس لوگوں کو فقہ کے معاملے میں بے فکر کر کے یہ سارا بوجھ اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اور یہ بات آپ کی اور اُن دوسرے حضرات کے کلام کو ملاحظہ کرنے سے بخوبی سامنے آجاتی ہے۔ اس کی مزید دلیل، اور ہمارے اس دعوے کی مزید تائید، تمام نقلی وعقلی علوم وفنون میں آپ کی مفید و پُر علم تصانیف سے بھی ہوتی ہے......

...... اور جیسا کہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، حدیث کی روایت اور رجال کی معرفت میں آپ عظیم امام، قابلِ بھروسہ، ثقہ، اور امام بخاری ومسلم اور دوسرے اصحابِ صحاح وسنن کی طرح حجت ہیں۔ اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، روایت میں مشہور ائمۂ حدیث کے ساتھ شرکت اور وسعتِ روایت اس پر بہترین دلیل ہیں۔

رہی بات آپ کی تصنیفات کی، تو وہ بہت ہی اچھی اور کثیر الفوائد کتب ہیں، خصوصاً کتاب "معاني الآثار" کے تو کیا ہی کہنے ہیں۔ جو بھی منصف شخص اس کو دیکھے اور بنظرِ تأمل اس کا مطالعہ کرے گا، تو حدیث کی کئی مشہور ومقبول کتب پر اسے راجح محسوس کرے گا۔ اور اس کتاب کے کلام اور ترتیب میں غور وفکر کرنے اس کی ترجیح ظاہر ہو جائے گی۔ یہ ایسی بات ہے جس میں کسی جاہل یا معاند قسم کے متعصب شخص کو ہی شک ہو سکتا ہے۔

باقی امام طحاوی کی کتاب کا سنن ابوداود، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ جیسی کتب پر فائق اور راجح ہونا ایسی کھلی بات ہے جس میں جاہل کے سوا کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ اس ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں وجوہِ استنباط، وجوہِ معارضات کا اظہار، ناسخ ومنسوخ کی تمیز جیسی خوبیوں کا موجود ہونا، ایسے اوصاف ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ہیں۔ یہ ایک بنیادی کتاب ہے، اور حدیث کی معرفت میں اس پر مکمل اعتماد کیا جاتا ہے۔ جب کہ باقی کتب میں یہ باتیں موجود نہیں ہیں۔ اور یہ فرق آپ خود دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ: یہ کتاب اس لیے باقی کتب سے مرجوح ہے کہ اس میں بعض ضعیف اور ساقط الاعتبار قسم کے راوی موجود ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ: باقی کتبِ سنن بھی تو اس قسم کے راویوں سے بھری پڑی ہیں۔ بلکہ ان کے بارے میں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ: وہ کتب، بعض باطل اور موضوع احادیث سے بھی خالی نہیں ہیں۔ رہی بات ضعیف احادیث کی، تو ان کے ہاں وہ بھی بہت زیادہ ہیں۔

اگر امام طحاوی کی کتاب کا موازنہ سنن دارقطنی، سنن دارمی یا سنن بیہقی جیسی کتب کے ساتھ کیا جائے تو وہ اس کے برابر چلنا تو درکنار، پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ اور مذکورہ بالا کتب نہ تو میدان میں اس کی برابری کر سکتی ہیں، اور نہ ہی میزان میں اس کے ہم پلہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا مخفی خزانے اور چھپے ہوئے دفینے کی طرح ہونا ایسا حجاب ہے جس کی وجہ سے بہت سی کتبِ حدیث پر اس کا راجح ہونا، کئی ایک لوگوں پر واضح نہیں ہو سکا۔ ہر وہ شخص جو اس کتاب سے استخراج کی کوشش کرے، اس کے عجائبات اس کے سامنے اچانک اور خود بخود نہیں آ جاتے، اور نہ ہی استنباط کی کوشش کرنے والا ہر کوئی ان غرائب کو اتفاقاً پا سکتا ہے۔ ہمیشہ سے اس پر یک گونہ اختفاء کا پردہ ہی پڑا رہا، اور کبھی یہ منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوئی۔ یہ معاملہ یونہی چلتا رہا، حتیٰ کہ اس کا سورج غروب ہونے، اور چاند ڈوبنے کے قریب ہو گیا۔ اور یہ سب متاخرین کے قصورِ فہم، اور اس کتاب کو توجہ نہ دینے کے ساتھ ساتھ ایسی چیزوں میں مشغول ہونے کے سبب تھا جو اس باب میں قطعاً فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔ اور اس سب پر مستزاد متعصب مخالفین کا اس کتاب کے ساتھ جانبدارانہ رویہ، اور ان کی یہ کوششیں تھیں کہ اس کتاب کے آثار اور نام ونشان ہی مٹ جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حق کو حق، اور باطل کو باطل کی صورت میں واضح کر کے رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے لوگوں کو پیدا کیا جو اس کتاب کا حق ادا کرنے کھڑے ہوئے، اور انہوں نے اس قریب المرگ کتاب کو زندہ کر دیا۔ اور اس کے وہ محاسن جو مٹنے کو تھے انہیں پھر سے واضح کر دیا۔ اس طرح اپنی ہم مثل کتابوں پر اس کی ترجیح اور ان کی اشکال پر اس کا تفوق ظاہر ہو گیا"۔

"ما تمسُّ إليه الحاجة" کی عبارت مکمل ہو گئی۔

میں کہتا ہوں: امام ابوعبد اللہ ذہبی (ت ۷۴۸ھ) نے اپنی کتاب "تذکرة الحفاظ" میں حافظ ابن زبر ربعی (ت ۳۷۹ھ) ......

......رحمہ اللہ کے حالات میں کہا ہے:

علی بن موسیٰ سمسار کہتے ہیں: ابوسلیمان نے کہا: ابوجعفر طحاوی نے میری تصنیفات میں بعض چیزیں دیکھیں، ان کے بعض ورق پلٹے، پھر کہنے لگے: اے ابوسلیمان! تم پنساری ہو، جب کہ ہم طبیب ہیں"۔

حافظ سید عبدالحیٔ کتانی نے اپنی کتاب "فهرس الفهارس والأثبات" (۱: ٤۳) میں حافظِ حدیث کے بارے میں کہا ہے:

حافظ ابن حجر نے "ابناء الغمر" میں حافظ تقی الدین بن رافع کے حالات میں کہا ہے: علامہ سبکی نے آپ کو ابن کثیر وغیرہ پر مقدم قرار دیا ہے۔ اور مجھ سے ہمارے شیخ عراقی نے کہا ہے: تقی الدین بن رافع کو رحلت وطلب کا جو اہتمام اور اجزاء کی جو معرفت حاصل تھی، اس کی وجہ سے موصوف نے ان کو دوسروں پر مقدم قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں: انصاف کی بات یہ ہے کہ: ابن کثیر کی بہ نسبت ابن رافع اہل حدیث کے طریق حفظ کے زیادہ پابند تھے۔ اس لیے کہ وہ عوالی، اجزاء، وفیات اور مسموعات کو، بخلاف ابن کثیر، خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اور حافظ ابن کثیر، ابن رافع کی بہ نسبت فقہاء کے طریق حفظ کے زیادہ قریب تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں فقہی وتفسیری متون کی معرفت کا اہتمام زیادہ تھا۔ اب جو محدث ان دونوں اسالیب کا جامع ہو، وہی حافظ کامل ہوگا، لیکن عصر اوّل میں پائے جانے والے حفاظ جیسے ابن خزیمہ، طحاوی، ابن حبان اور بیہقی، کے بعد بہت کم ہی کسی کے ہاں ایسی جامعیت پائی جاتی ہے، یا متاخرین میں ہمارے شیخ عراقی ہیں۔

امام عصر، نخبۂ دہر، حافظِ عصر علامہ سید انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

امام طحاوی تمام لوگوں سے زیادہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کو جانتے تھے۔ بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ تمام مذاہب کے عالم تھے۔ اور وہ امام شافعی سے یک واسطہ اور امام مالک سے دو واسطوں سے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے تین واسطوں سے روایت کرتے ہیں اور "شرح معاني الآثار" میں کتاب الحج میں، امام احمد رحمہ اللہ سے یک واسطہ روایت کی ہے۔

اور جیسا کہ ابن اثیر جزری نے کہا ہے: آپ مجتہد امام اور مجدد تھے۔ مزید کہتے ہیں: میں نے جو انہیں مجدد کہا ہے تو وہ شرح حدیث، اس کے محامل وغوامض اور بحث وتحقیق کے اعتبار سے ہے۔ آپ اپنی انوکھی طرز کے امام تھے۔ چنانچہ قدماء محدثین تو اپنی کتب میں روایتِ حدیث پر قناعت کرتے تھے، اور تفصیلی بحث وتحقیق سے تعرض نہ کرتے تھے۔

دیکھیے: مَعَارِفُ السُّنَن (۱ : ۱۱٤)، طبع كراچي، العَرفُ الشَّذِي، (ص ٤٥) طبع الهند.

میں کہتا ہوں: حافظ شمس الدین ابن جزری (ت ۸۳۳ھ) نے اپنی کتاب "غاية النهاية" میں محمد بن سنان بن سرح بن ابراہیم ابوجعفر تنوخی شیزری ضریر قاضی، کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

امام طحاوی نے آپ ہی سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب اخذ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے شیخ عیسیٰ شیزری سے، اور انہوں نے محمد بن حسن شیبانی سے حاصل کیا تھا۔

شیخ ابوالحسنات محمد عبدالحیٔ لکھنوی اپنی کتاب "الفوائد البهيّة في تراجم الحنفية" (طبع مصر، ص ۳۲) میں کہتے ہیں:

امام طحاوی نے فقہ کا علم ابوجعفر احمد سے حاصل کیا۔ پھر شام جا کر ابوخازم عبدالحمید سے ملے جو شام کے قاضی القضاۃ تھے، اور ان......

...... سے پڑھا۔ اور وہ فقہ میں عیسیٰ بن ابان کے، اور وہ امام محمد رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔

حافظ عصر سید انور شاہ کشمیری نے صحیح مسلم کے امالی میں امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے بارے میں یوں کہا ہے:

میرے نزدیک طحاوی شریف کا مرتبہ، کسی طرح بھی سنن ابوداود سے فروتر نہیں ہے۔ بلکہ سنن ابوداود مرتبہ میں اس کے قریب پہنچتی ہے، کیونکہ طحاوی شریف دو وجھوں سے صحیح ہے۔ ایک تو سند کے اعتبار سے، اور دوسرے متن کے اعتبار سے صحیح ہے۔

جہاں تک سند کا تعلق ہے، تو اس کے اکثر راوی سنن ابی داود ہی کے راوی ہیں، سوائے جابر جعفی کے، کہ امام ابوداود نے ایک روایت ان سے بھی لی ہے۔ بعض لوگوں نے جابر پر جرح کی ہے، اور بعض نے اس کی توثیق کی ہے۔ حتیٰ کہ جب شعبہ نے سفیان ثوری پر یہ اعتراض کیا کہ: آپ جابر جعفی سے روایت نہیں کرتے، تو انہوں نے کہا: میں بعض غلطیوں پر مطلع ہوں۔ اور وہ صرف صحیح احادیث ہی بیان کرتا ہے۔

خوب جان لو کہ: وہ لوگ جو احادیث سے اشتغال رکھتے ہیں، دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ پہلا گروہ صحیح احادیث کے سوا دوسری احادیث کو نہ تو قابلِ اعتناء سمجھتا ہے، اور نہ ہی اسے بیان کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ اور صحیح کے سوا جتنی احادیث ہیں انہیں ترک کر دیتا ہے۔ یا ان کے ساتھ تذبذب اور شک کا معاملہ کرتا ہے کہ پتہ نہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟

جب کہ دوسرا گروہ محدثین کی ذکر کردہ شروط کو اپنی کتاب میں مدنظر رکھتا ہے۔ پھر اس قسم کے محدثین اگر صحیح اور سقیم کی پرواہ نہ کرتے ہوں، تو ان کی بیان کردہ اسناد کو دیکھنا ضروری ہے۔

اور وہ محدثین جنہوں نے بعض شرائط کا التزام کیا ہے، ان کے بارے میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کی شرائط نقل کر کے ان پر اعتماد کریں۔ عام ہے کہ وہ امام بخاری ہوں یا امام مسلم، یا امام ابوداود ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہو۔ ابن تیمیہ وغیرہ نے اسی موقف کو اپنایا ہے۔

استاذ انور شاہ نے کہا ہے:

ہمیں تو ان پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ کیا ہم ابن حجر پر تو بھروسہ کر لیں، اور امام نسائی، ابوداود اور امام طحاوی کو چھوڑ دیں، حالانکہ یہ ائمہ تو اجلہ محدثین میں سے ہیں۔ یہ مشورہ تو جاہل، لاعلم اور متعصب لوگوں کی طرف سے ایک دھوکہ ہے۔ ورنہ اگر کسی مسلّم چیز کو نظری بنانا ہی ہے، تو پھر صحیح بخاری اور مسلم کی کیا خصوصیت ہے۔ انہیں بھی نظری قرار دینا چاہیے۔ اور بحث وتمحیص اور تفتیش کے بعد تمہیں پتہ چل جائے گا کہ صحیحین کے رُواۃ بھی جرح اور تقدیح سے سالم نہیں ہیں۔

ہم نے شاہ صاحب کی یہ تقریر، صحیح مسلم پر موصوف کے ان امالی سے نقل کی ہے، جنہیں ان کے تلمیذ سید مناظر احسن گیلانی (ت ۱۳۷۵ھ) نے ضبط کیا تھا۔ یہ تقریر صاحبِ "فتح الملهم" علامہ شبیر احمد عثمانی (ت ۱۳۶۹ھ) کے پاس محفوظ تھی، جس سے انہوں نے اپنی مذکورہ بالا مبسوط شرح میں استفادہ کیا ہے۔ ہم نے شاہ صاحب کے تلمیذ رشید محقق مفضال شیخ محمد یوسف بنوری سے مانگ کر ان امالی کا مطالعہ کیا تھا۔ اور انہوں نے یہ امالی شیخ عثانی کے بھائی سے کچھ عرصہ کے لیے مانگے تھے۔

امام طحاوی کے حالاتِ زندگی کو شیخ محمد زاہد کوثری نے مستقل رسالے میں جمع کیا ہے اور اس رسالے کا نام "اَلحَاوِي فِي سِيرَةِ الإمَامِ الطَّحاوِي" رکھا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ مرحوم محمد یوسف بن محمد الیاس کاندھلوی، ثم دہلوی نے بھی (جو ہند میں تبلیغی جماعت کے رئیس تھے)، اپنی کتاب "أماني الأحبار في شرح معاني الآثار" میں آپ کے حالات ذکر کیے ہیں، اور امام طحاوی کی کتاب "شرح معاني الآثار" کی بڑی خوبصورت تعریف کی ہے۔

تمسک کرتے ہیں۔ اور ابن عبد البر مالکی تو اس جماعت کے سرخیل ہیں، ان کی دو کتابیں "الاِسْتِذْکَار" (۸۴) اور "التَّمْهِيْد" ان کی یادگار کتب ہیں۔

بالجملہ، یہ تمام ائمہ ایسے ہیں جن کے اقوال معتمد علیہ ہیں اور ان کا کلام مرجع کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، ورنہ کتب حدیث کے شارحین کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے اور ان کی کتب کے، صرف نام شمار کرنا بھی بہت مشکل ہے، اور ان میں سے ہر ایک کی شان نرالی ہے۔ لیکن (یہ متاخر شارحینِ حدیث) گوناگوں خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود ائمہ متقدمین ہی سے اخذ کرتے ہیں۔ اور اگر کسی کو ان متقدمین کی جماعت کی کتابیں مل جائیں، تو متاخرین کی تشویش ناک ابحاث اور دین میں ان کے بودے تکلفات کی حقیقت واضح ہو جائے گی، اور وہ ان ابحاث کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

اور احادیث کے معانی سمجھنے اور ان میں تعارض دور کرنے کے موضوع پر شیخ شاہ ولی اللہ (۸۵) محدث دہلوی رحمہ اللہ کے قواعد بڑے عجیب اور فوائد بڑے انوکھے ہیں اور مختلف الحدیث کے موضوع پر "کِتَابُ الْمُغِيْث" بہت اچھی اور اس باب میں قابل تقلید نمونہ قرار دیے جانے کے لائق ہے۔

---

۸۴ : الاستذكار لمذاهب أئمة الأمصار وفيما تضمنه الموطأ من معاني الرأي والآثار، اور التّمهيد لما في الموطأ من المعاني والأسانيد. ابن حزم نے کہا ہے:

"ہمارے شیخ ابو عمر کی ایک کتاب "التّمهيد" ہے۔ فقہ الحدیث پر جس قدر بہترین کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے اس جیسی کوئی دوسری کتاب میرے علم میں نہیں ہے۔ اور جب اس جیسی نہیں ہے تو اس سے بہتر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موصوف کی کتاب: "الاستذكار" مذکورہ بالا کتاب "التمهيد" ہی کا اختصار ہے۔ آپ کی دوسری کئی تالیفات بھی ہیں، کہ جمع معانی میں ان کی مثل کوئی کتاب نہیں ہے۔

۸۵ : شیخ ولی اللہ دہلوی فقہاء محدثین میں سے تھے۔ چنانچہ آپ نے خود "الجزء اللّطيف في ترجمة العبدِ الضّعيف" نامی اپنے رسالے میں کہا ہے:

"اس فقیر نے مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کے سمندر میں بہت گہری غوطہ زنی کی ہے۔ مزید برآں ان احادیث میں بھی خوب غور وفکر کیا ہے جو احکام میں ائمۂ مذاہب کا مستدل اور متمسکات ہیں۔ اور غیبی نور کی تائید سے فقیر نے احادیث میں سے فقہاء محدثین کے طریق کو منتخب کر لیا"۔ آپ ہی اپنی ایک دوسری کتاب "الفوزُ الكبير في أصول التّفسير" (ص ۵۲، كراچي مغربي پاكستان ۱۳۸۰ھج) میں رقم طراز ہیں:

"الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے فقیر کو تمام فنون سے مناسبت حاصل ہے۔ اور میں نے فنون کے اکثر اصول اور ان کی فروع کی ایک بڑی مقدار کو حاصل کیا ہے۔ چنانچہ مجھے ہر باب میں اجتہاد فی المذہب کی طرح کا تحقیقی ذوق اور آزاد بلند نظری حاصل ہو گئی ہے۔ فیضِ الٰہی کے سمندر سے میرے جی میں مذکورہ بالا فنون کے علاوہ، تفسیری فنون میں سے دو یا تین فن خصوصاً القاء کیے گئے ہیں۔ اور اگر تم مجھ سے سچی بات پوچھو تو میں بلا واسطہ قرآن عظیم کا شاگرد ہوں، جیسا کہ میں حضرتِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ اقدس، جو تمام فتوح کا منبع ہیں، کی روحِ انور (سے استفادہ) کی وجہ سے اویسی ہوں۔ اور میں کعبہ مشرفہ سے بھی بلا واسطہ مستفید ہوا ہوں، جیسا کہ بلا واسطہ نماز جیسی نعمتِ عظمیٰ سے متأثر ہوں۔ ......

ولو أن لي في كل منبت شعرة لساناً لما استوفيتُ واجبَ حَمدِه

ترجمہ: اگر میرے ہر بنِ مو میں ایک زبان ہوتی، اور میں ہر زبان سے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا، تو بھی اس کی شان کے لائق واجب ادائیگی شکر ادا نہ کرسکتا۔

اسی لیے آپ کے شیخ اجل ابوطاہر محمد عبدالسمیع کردی مدنی (ت ۱۱۴۵ھ) فرمایا کرتے تھے: یہ تو مجھ سے سنداً الفاظ حاصل کرتا ہے، اور میں اس سے معانی ومفہوم کی تصحیح کرتا ہوں۔

شیخ کردی نے آپ کو جو اجازتِ روایت یہ کہہ کر:

"وعند ما تشرّفتُ بلقائه، وأشرقت أضواء وفائه، فإنّه طلب مني أمرا، هو أحرى أن يقتبس من مشكاته وسني شهباته".

دی ہے، اس میں آپ سے ملنے کو ''شرفِ ملاقات حاصل ہونا'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

مزید شیخ کردی فرماتے ہیں:

میں چاہتا ہوں کہ وہ اشعار بھی لکھ دوں جو شیخ عبداللہ بن محمد بن ابی بکر عباس مغربی نے لکھے تھے، اور وہ اجازت جو انہوں نے میرے والد صاحب رحمہ اللہ کو دی تھی، اور اس وقت کہا تھا:

أجزتُك لكن مثلك من يُجيزني ولم يستفد مني ولكن يفيدني

ترجمہ: میں تمہیں اجازت دے تو رہا ہوں، لیکن آپ جیسے لوگ تو مجھے اجازت دیتے ہیں، کہ جنہوں نے مجھ سے کوئی استفادہ نہیں کیا، بلکہ میں نے ان سے استفادہ کیا ہے۔

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ فقہاءِ محدثین میں شمار کیے جانے کے پورے حق دار ہیں۔ اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جنہوں نے آپ کو صرف حفاظ محدثین میں شمار کیا ہے، چنانچہ سید عبدالحیٔ کتانی فاسی (ت ۱۳۸۱ھ) اپنی کتاب "فهرس الفهارس والأثبات" (۲: ۴۳۸) میں رقم طراز ہیں:

میں کہتا ہوں: جو بات مجھ پر ظاہر ہوئی ہے، وہ یہ کہ آپ کا شمار بارہویں صدی کے حفاظ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے احادیث کے لیے اسفار کیے، اور پھر آپ کی طرف سفر کیا جانے لگا۔ آپ نے حدیث روایت کی، تصنیف وتالیف کی۔ آپ کے اپنے اختیارات اور ترجیحات تھیں۔ آپ نے ہند میں علم کا بیج بویا۔ اس کا درخت اگا، اس پر پھل آئے، پھر ان میں ذائقہ پڑا، اور کھجوروں کی طرح پک جانے کے بعد مخلوقِ خدا نے اسے کھایا۔

پہلی جلد کی ابتدا میں (صفحہ ۴۹ پر) گذشتہ پروگرام میں ان کا تذکرہ ہم سے رہ گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے حالات جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ جن لوگوں نے آپ سے علم حاصل کیا ہے، ان میں حافظ زبیدی بھی تھے۔ انہوں نے بلادِ عربیہ کے اسفار سے پہلے ہند میں آپ سے حدیث اخذ کی ہے۔

مذکورہ بالا نقل میں جو کچھ کتانی نے کہا ہے (یعنی یہ کہ شاہ صاحب صرف حافظ محدث تھے) وہ بلا دلیل ہے، لہٰذا، وہ قابلِ اعتماد بات نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی بھروسہ ہے۔......

ایسے ہی جس نے سرے سے انکار کرتے ہوئے شاہ صاحب پر لفظ ''محدث'' کے اطلاق کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، جیسے سید محمد صدیق حسن القنوجی، تو اس نے بھی حد سے تجاوز کیا ہے۔ چنانچہ قنوجی نے اپنی کتاب "سلسلة العسجد في ذكر مشايخ السند" میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ محدث کے نام کا استحقاق جہدِ بلیغ کے ساتھ طلبِ حدیث کے لیے لمبے سفر طے کرنے اور اس کے ٹھوکریں کھانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ہر فقیہ، اور مشکاۃ المصابیح اور مشارق الانوار کا قاری ہرگز اس بات کا حق دار نہیں ہے کہ اسے ''محدث'' کے نام سے پکارا جائے۔ لیکن عامۃ الناس ان باریک فروق میں تمیز نہیں کرتے۔ جب وہ کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ حدیث کی کسی کتاب کے درس وتدریس میں مشغول ہے تو اسے ''محدث'' کے نام سے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عوام الناس کی کوتاہی ہے، حدیث کا اشتغال رکھنے والی کی نہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مذہبِ حنفی کے فقیہ تھے۔ اور اسی قبیل (یعنی صرف حدیث کی کسی کتاب سے اشتغال رکھنے کی وجہ) سے انہیں ''محدثین'' میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور ہمارے علم کے مطابق حضرت شیخ (یعنی عبدالحق محدث دہلوی) نے صحاح ستہ کو اہلِ اثر کے ہاں معتبر طریق کے موافق نہیں پڑھایا۔ اگرچہ انہوں نے تبرک کے لیے ان کتب کی اجازت حاصل کر رکھی تھی۔ بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی اولادِ امجاد کا مرتبہ ان سے بلند اور زیادہ ہے، اگرچہ یہ سب حضرات بھی اہلِ اثر کے معیار کے موافق تحدیث کے عالی معیار تک نہیں پہنچ پائے''۔

قنوجی کی اس عبارت پر تعجب بالائے تعجب ہے۔ انہی نے "أبجد العلوم" (ص ۸۷۷) میں اپنے شیخ کے شیخ، جناب قاضی شوکانی کے بارے میں:

"شيخنا الإمام العلامة الرباني، والسهيل الطالع من القطر اليماني، إمام الأئمة ومفتي الأمة، بحر العلوم، وشمس الفهوم، سند المجتهدين الحفاظ، فارس المعاني والألفاظ، فريد العصر، نادر الدهر، شيخ الإسلام، قدوة الأنام، علامة الزمان، ترجمان الحديث والقرآن، علَم الزُّهاد، أوحد العباد، قامع المبتدعين، آخر المجتهدين، رأس الموحدين، تاج المتبعين، صاحب التصانيف التي لم يسبق إلىٰ مثلها قاضي الجماعة، شيخ الرواية والسماعة، عالي الإسناد، السابق في ميدان الاجتهاد علىٰ الأكابر الأمجاد المطلع علىٰ حقائق الشريعة ومواردها، العارف بغوامضها ومقاصدها"

کہہ کر تعریف کے جو پُل باندھے ہیں، ان کا مبالغہ اور افراط ہونا محتاجِ بیان نہیں ہے۔

اس قدر مبالغہ کرنے کے باوجود بھی وہ راضی نہیں ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ: اس قدر مکھن لگانے کے بعد بھی تعریف کا حق ادا نہیں ہو پایا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طیبی، ملا علی قاری، شیخ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح، علامہ شوکانی، فقہاء محدثین میں سے نہیں ہیں۔ اور اپنی جلالتِ شان کے باوجود بھی ان حضرت کے بلند مرتبے کو چھو نہیں سکے۔ ان کی نظر صرف چھلکے پر ہے، مغز تک ان کی رسائی نہیں۔ جب کہ شیخ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، دونوں ہی فقہاء اور متقن محدثین میں سے ہیں۔ اور برعایتِ شرائطِ محدثین، تحدیث میں آپ کا قدم انتہائی راسخ ہے۔ دونوں حضرات صاحبِ ثبت ہیں، اور انہیں تلقی بالقبول الحسن حاصل ہے۔ اور قنوجی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے، وہ حنفیہ کی ضد میں ان کے تعصب کے سبب ہے، ورنہ کہاں زمیں اور کہاں فلک۔

حق تو یہ ہے کہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قدر ومنزلت علامہ طیبی جیسی ہے۔ اور علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانی نے حافظ سیوطی سے علامہ طیبی کے حق میں جو کچھ نقل کیا ہے، بعینہ وہ سب شاہ صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ علامہ زرقانی (شرح الزرقاني علىٰ المواهب ......

...... اللدنیة" (٥: ٧٧، طبع مصر) میں کہتے ہیں:

''سیوطی نے کہا ہے: علامہ طیبی کو حدیث میں مہارت تھی، لیکن آپ حفاظ کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ آپ کی منتہائے نظر صحاح ستہ، مسند احمد اور سنن دارمی تھی۔ چنانچہ آپ ان سے باہر نہیں نکلتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صاحبِ کشاف کسی معروف حدیث کو نقل کرتے ہیں، لیکن علامہ طیبی اس کی تخریج بھی اچھے طریقے سے نہیں کرتے، اور ان کتب میں موجود بالمعنی حدیث کی طرف عدول کر جاتے ہیں۔ اور یہ طرزِ عمل تخریج میں کمی رہ جانے کا آئینہ دار ہے''۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ظاہری و باطنی فضائل و کمالات، دقتِ نظر اور گہرائی جیسی صفات کے جامع ہونے میں سلفِ صالحین جیسے تھے۔ چنانچہ اپنے بارے میں خود ہی رقم طراز ہیں:

''اس فقیر پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے اسے خلعتِ فاتحیت سے نوازا، اور اس فقیر کو جمع فقہ وحدیث، اسرارِ سنن اور احکام کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں کی مصالح کا علم الہامی طور پر عطا فرمادیا، کہ جنہیں رسول اللہ ﷺ، اپنے رب سے لے کر آئے۔ حتیٰ کہ اس فقیر نے اہلِ سنت کے عقائد کو دلائل و حجج سے ثابت کر کے، اہلِ معقول کی گرد سے پاک کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فقیر کو ابداع، خلق، تدبیر، طول وعرض کے ساتھ تدلی اور انسانی نفوس کی استعداد کے تمام علوم عطا کیے۔ پھر اس فقیر کو حکمتِ علیہ اور توفیق کے ساتھ ساتھ ابحاث کو کتاب وسنت سے مدلل کر کے مضبوط کرنا، علومِ نقلیہ کو محرف و مدخول باتوں سے واضح اور متمیّز کرنا اور ناپسندیدہ بدعات اور سنّتِ محمودہ میں فرق کرنا بھی وافر مقدار میں عطا کیا گیا''۔

شاہ عبد العزیز دہلوی اپنی کتاب "بستان المحدّثین في تذكرة كتب الحديث و المحدثين" میں رقم طراز ہیں:

ہمارے شیخ اور تمام علوم وامور میں ہمارے لیے قابلِ تقلید نمونہ، شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی قدّس سرّہ نے "الموطا" بہ روایتِ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کی احادیث اور آثار کی دو شرحیں لکھی ہیں۔ اور اس میں سے امام مالک کے اقوال کے ساتھ بعض بلاغات کو بھی حذف کر دیا۔ ان شروح میں سے پہلی تو مجتہدین کے اسلوب پر ہے۔ یہ شرح فارسی زبان میں ہے، اور موصوف نے اس کا نام "المصفّٰی" رکھا ہے۔

دوسری شرح مختصر ہے، جس میں شیخ نے فقہاء حنفیہ اور شافعیہ کے مذاہب کو بیان کرتے ہوئے، بس بقدرِ ضرورت غریب الفاظ کی شرح اور مشکل الفاظ کے ضبط پر اکتفا کیا ہے۔ آپ نے اس شرح کا نام "المسوّى من أحاديث الموطأ برواية يحيىٰ بن يحيىٰ" رکھا ہے۔ یہ شرح عربی میں ہے''۔

میں کہتا ہوں: آپ کی کتاب "حجةُ اللّٰه البالغة في أسرار الحديث وحكم الشرعية" کا موضوع اگرچہ اسرارِ شرعیہ اور اس کے معارف کا بیان ہے، مگر یہ کتاب گذشتہ پانچ مباحث سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ یہ کتاب مشکاۃ المصابیح کی احادیث کی شرح ہے، جس میں آپ نے ایسے محیر العقول اسرار و معارف کو بیان کیا ہے کہ جن کے اظہار سے متقدمین ومتاخرین بھی عاجز نظر آتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسی فضیلت ہے جس میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ آپ کی یہ کتاب آپ کے تنقیح شدہ علوم کی جامع اور آپ کی تصانیف میں سے بہترین ہے۔

سید عبد الحیٔ حسنی اپنی کتاب "نزهة الخواطر" (٦: ٤٠٢) میں رقم طراز ہیں:

''آپ کے بیٹے شاہ عبد العزیز نے امیر حیدر بلگرامی کو بھیجے جانے والے خط میں کہا ہے: ......

والد صاحب کی کتاب "حجة الله البالغة" علمِ حدیث کے اسرار میں آپ کی تصانیف میں سے عمدہ ترین ہے۔ آپ سے پہلے اس فن میں، اس اسلوب سے کسی نے لب کشائی نہیں کی، کہ اصول بھی وضع کیے ہوں، فروع کی تفریع بھی کی ہو، مقدّمات ومبادی کی تمہید بھی باندھی ہو، اور پھر ان مقدمات سے مقصودی نتائج بھی اخذ کیے ہوں۔ اس علم کی کسی قدر خوشبو غزالی کی "إحياء العلوم" اور شیخ عز الدین عبد السلام مقدسی کی "القواعد الكبرىٰ" میں سونگھنے کو ملتی ہے۔ اس علم کے بعض مزید فوائد، شیخ اکبر کی "الفتوحات المكية"، شعرانی کی "الكبريت الأحمر في علوم الشيخ الأكبر" اور ان کے تلمیذ شیخ کبیر شیخ صدر الدین قونوی قدس سرہ کی تالیفات میں ملتے ہیں۔ اور شیخ عبد الوہاب شعرانی نے "كتاب الميزان" میں ان سب کو جمع کر دیا ہے"۔

وليس على الله بمستنكر أن يجمع العالَم في واحد

صدیق حسن خان قنوجی نے اپنی کتاب "أبجد العلوم المسمّٰى بالسّحاب المركوم في بيان أنواع الفنون وأقسام العلوم" میں کہا ہے:

علم تبيين المصالح المرعية في كل باب من الأبواب الشّرعية:

یعنی: ابوابِ شرعیہ میں سے ہر باب میں جن مصالح کی رعایت کی جاتی ہے، یہ باب ان مصالح کی وضاحت کے بارے میں ہے۔

مذکورہ بالا عنوان ذکر کرنے کے بعد، یوں رقم طراز ہیں:

"اس علم میں شیخ اجل ولی اللہ بن عبد الرحیم عمری دہلوی (ت ۱۱۷۶ھ) کی کتاب "حجة الله البالغة" ہے۔ بہت کم علماء نے اس موضوع پر تصنیف کی یا اس کی بنیادیں اٹھانے میں غور وفکر کیا، یا اس کے اصول وفروع کو مرتب کیا ہے۔ اور بہت کم کسی نے اس موضوع پر ایسی تحریر کی ہے جو طبیعت کو سیر کر دے۔ اور اس موضوع میں کثرت کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ ابوابِ شرعیہ کے اسرار کو وہی شخص جان سکتا ہے جو تمام علوم شرعیہ میں پوری طرح ماہر ہو، اور فنونِ الٰہیہ میں اخیر تک رسوخ حاصل کرنے کی وجہ سے منفرد ہو۔ اور ایسی صفائی مشرب اسی شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے سینہ کو اللہ تعالیٰ نے علمِ لدنی کے لیے کھول دیا ہو، اور وہبی اسرار سے اس کا دل بھر دیا ہو۔ اور اس سب کے ساتھ وہ طبیعتاً ہی بلا کا ذہین اور فطرتاً ذہنی صلاحیتوں میں بہاؤ کا مالک ہو۔ تقریر میں ماہر، تحریر میں پختہ کار ہو۔ توجیہات اور خوش بیانی میں انوکھا ہو۔ یہ بھی جانتا ہو کہ اصول کیسے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی بنا پر فروع کی تخریج بھی جانتا ہو، قواعد کی بنیاد رکھنے کا طریقہ پتہ ہو، اور پھر ان کے معقول ومسموع شواہد تک ان کی نظر ہو۔ میرے علم کے مطابق ایسا شخص کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ان تمام صلاحیتوں سے نوازا ہو، صاحبِ حجّہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ موصوف اس علم میں تالیف کرنے والے منفرد مصنف ہیں، اور آپ نے اس تالیف سے لوگوں کو دلائل وحجج کی راہ دکھادی ہے۔ واللہ اعلم"۔

اپنی جلالتِ قدر اور علوم ومعارف میں بلند مرتبہ کے باوجود آپ سے بعض ایسے شذوذ اور زلّات کا صدور ہوا ہے، جن سے احتراز واجب ہے۔ محدث ناقد شیخ محمد زاہد کوثری نے اپنی کتاب "حسن التقاضي" (ص ۹۶ طبع مصر ۱۳۶۸ھ) میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

"آخر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ عالمِ خبیر شیخ احمد بن عبد الرحیم دہلوی رحمہ اللہ کے بارے میں چند باتیں اس وجہ سے گوش گذار کر دوں کہ آپ نے اپنی کتب میں بڑی سیلانی طبع اور جرأت کے ساتھ، اجتہاد اور تاریخ فقہ وحدیث کی مباحث سے بہت زیادہ تعرض کیا ہے، جب کہ آپ......

کے انداز فکر میں تنگ راور اجتہادی مباحث کی تصویر کشی میں خود رائی پائی جاتی ہے، حالانکہ ان موضوعات پر لکھی گئی متقدمین کی کتب کے بارے میں آپ کا دائرۂ اطلاع بہت تنگ، اور احوال رجال کے ساتھ ساتھ علوم و مذاہب کی تاریخ کے بارے میں آپ کا مطالعہ بھی بہت تھوڑا ہے۔ آپ اپنے مخصوص ذہنی سانچے اور خیال میں بہتے چلے جاتے ہیں، جس نے کئی ابحاث اور تقریرات میں آپ کو بہت دور پہنچا دیا ہے۔

آپ کی کتب حسن و جمال سے پُر ہیں اور ان میں کئی قسم کی فائدہ مند باتیں بھی ہیں۔ لیکن ان میں آپ کے بعض ایسے تفردات بھی ہیں جن کی متابعت ہرگز صحیح قرار نہیں دی جاسکتی، جس کی وجہ یہی ہے کہ آپ کے ہاں ایسا فکری اضطراب ہے جس سے آپ کسی موضوع کی تحقیق میں اصابتِ رائے سے ہٹ گئے ہیں، اور ان اقوال کی اتباع سے تابع اور متبوع دونوں ہی شطحیات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اور کئی جگہوں پر تمہیں ان کی ایسی مسلسل عبارتیں مل جائیں گی جن کا اہل تحصیل کے ہاں کوئی حاصل نہ ہوگا۔ میں یہاں آپ کے فکری اضطراب کی طرف اجمالی اشارہ کر دیتا ہوں، تا کہ جس نے آپ کی زندگی کا گہرا مطالعہ نہیں کیا، وہ آپ سے پوری طرح واقف ہو جائے۔ اور جہاں تک آپ کے حد سے بڑھے ہوئے تفردات کا تعلق ہے، تو ان کا تفصیلی تجزیہ بھی خاص فراغت کا تقاضا کرتا ہے۔

ہندوستان میں علمِ حدیث کی ترویج میں آپ کی خدمات اور جدوجہد پر ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ لیکن جن مقامات پر آپ صواب رائے سے ہٹ گئے ہیں، بایں ہمہ جلالتِ علمی، آپ کا مرتبہ ہمیں ان مقامات کی نشان دہی سے سکوت کو مباح نہیں کرتا، چنانچہ میں کہتا ہوں:

آپ کی اعتقادی اور فروعی مسائل میں نشو و نما مذہب حنفیہ کے عین مطابق، اور توحیدِ شہودی کے قول میں عارف باللہ امام ربانی شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی کے مذاق پر ہوئی تھی۔ آپ نے اپنے دیار کے عرف کے موافق حدیث اور فلسفہ کا علم حاصل کیا۔ پھر حجاز کا سفر کیا اور مدینہ منورہ میں شیخ ابو طاہر بن ابراہیم کورانی شافعی سے صحاح ستہ پڑھیں اور ان کے ساتھ ایک عرصہ گذارا، اور ایک عرصہ تک ان کے والد کی کتب کا مطالعہ کرتے رہے، جن میں حشویہ، اتحادیہ، فلاسفہ اور متکلمین کی ایسی آراء کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی جن میں آپس میں ایک دوسرے کو دولتیاں جھاڑی گئی تھیں۔ چنانچہ آپ فقہ و تصوف میں ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

اس کے بعد جب آپ ہندوستان واپس آئے تو تصوف، فقہ اور اعتقاد میں اپنے گھر والوں کے مشرب اور اپنے خانوادے کے مذہب سے منحرف ہو کر توحیدِ وجودی کی رائے کے حامل ہو چکے تھے۔ اور بزبانِ حال آپ کہہ رہے تھے:

عقَدَ الخلائقُ في الإلٰه عَقائدًا ☆ وأنا اعتقدت جميع ما اعتقدوه

چنانچہ اس واپسی کے بعد جب آپ نے فقہی مذاہب میں اپنی آراء کی دعوت، اور حشویہ، فلاسفہ اور وحدت الوجود کے قائلین کی آراء کو جمع کرنے کی کوشش شروع کی، اور اکابر کا عقیدہ سمجھتے ہوئے، صورتوں میں تجلی اور مظاہر میں ظہور کے قول کو پھیلانے جیسی کوششوں میں ہمہ تن مصروف ہوئے، تو مسلمانوں کی وحدتِ کلمہ پارہ پارہ ہونے لگی۔ حالانکہ عقائد کے بارے میں حشویہ و فلاسفہ وغیرہم کی آراء حلول کا قائل ہو جانا ہی ہے۔ چنانچہ اربابِ عقول میں سے بلند پایہ اہلِ علم کے ہاں ایسے اقوال کو کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی۔ عہدِ قدیم میں ایسے کمزور اقوال کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔

آپ کے نواسے کی ایک کتاب "عبقات" ہے، جس میں انہوں نے گندھی مٹی میں مزید پانی ملا کر، رہتی دنیا تک کے لیے، کلمۂ ملت کو پارہ پارہ کر کے لامذہبیت اور حشویت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اصول و فروع میں حنفیت کو نظر انداز کرنے اور ان سے لڑتے جھگڑتے رہنے کی......

......داغ بیل ڈال دی۔ چنانچہ اب دیارِ ہندیہ میں لامذہبیت کا پودا نشوونما کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اگرچہ ان کے دادا جان (یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ) نے بعد میں اپنے بعض مبشرات کی وجہ سے، جسے انہوں نے "فیوض الحرمین" اور "تفهيمات الإلهية" میں ذکر کیا ہے، مذہب معین کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ (مزید دیکھیے: "فيض الباري" کا مقدمہ: ص۲۴)۔

اور دادا (یعنی شاہ ولی اللہ دہلوی) احادیث کے اصولِ ستہ کے متون کا بہت اہتمام کرتے تھے، لیکن ان کی اسانید پر نظر کیے بغیر صرف متون ہی پر اکتفا کر لیتے تھے۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ صرف متون پر ہی اقتصار کر لیا جائے تو تمام متونِ حدیث صرف ایک جلد میں سمٹ سکتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم کو اس بات کی ضرورت ہوا کرتی ہے کہ وہ فروعی مسائل میں متونِ احادیث کی سند کو بھی دیکھیں، خواہ وہ حدیث صحیحین میں کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ سننِ اربعہ۔ اہلِ علم کا معروف طریقہ یہی ہے۔ جب فروع میں اس قدر احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، تو عقیدے کے ابواب میں اسانید سے قطع نظر کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ اسناد کو دیکھے بغیر، صحاح ستہ کے صرف متون پر اکتفا کر لینے ہی کی وجہ سے موصوف کو مذاہبِ فقہاء اور ائمہ کی مسانید کے بارے میں خود رائی کی جرأت ہوئی۔ لیکن یہ تو بس ایک ہوائی قلعہ ہے جو اس لائن کے اہلِ تحقیق وتاریخ کے سامنے پرِ کاہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔

آپ کے عجیب وغریب تفردات میں سے یہ بھی ہے کہ: آپ انشقاقِ قمر کے معجزے کے بارے میں کہتے ہیں کہ: وہ تو بس دیکھنے والوں کو یوں نظر آیا تھا۔ حالانکہ نظر بندی اللہ کے رسولوں صَلَوَاتُ اللهِ وَسَلَامُہ علیهم أجمعين کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے۔

ایسے ہی اخبار وآثار میں وارد شدہ کئی باتوں کو آپ ایسی صورتوں پر محمول کرتے ہیں جو عالمِ تخیّل پر مبنی ہیں۔ اور اس عالم کو عالمِ مثال کا نام دے کر کہتے ہیں کہ اس میں معانی اجسام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جو کہ بعض ایسے متصوفہ کا خیال ہے جنہوں نے یہ باتیں افلاطونی مثالوں سے اخذ کی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ عالمِ خیال ایک ایسی چیز ہے جس کا شرع اور عقل میں کوئی وجود نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی علمی مشکلات کے حل کو اس عالم پر محمول کر دینا، مسائل کو محض خیالی چیز پر محمول کر دینا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو نا معلوم عالمِ مثال کے کھاتے میں ڈال دینے سے ان آثار کے معانی کی نفی کر دینا ہی لازم آ جاتا ہے۔ حالانکہ کسی بات کو ایسی چیز پر محمول کرنا جسے صدرِ اول کے مخاطبین کی فہم قبول نہ کر سکتی ہو، محض ہلاکت اور گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ حلِ مشکلات کا صرف یہی راستہ بچتا ہے کہ اسانید اور اس کے رجال کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ائمۂ مبرزین کے ہاں معتبر وجوہِ دلالت کو دیکھا اور ان میں غور وفکر کیا جائے۔

موصوف کے مزید تفردات اور اخطاء میں سے یہ بھی ہے کہ: آپ چشمۂ صافی سے قریب تر اور متقدم کی روایت کو گدلا خیال کر لیتے ہیں، جب کہ گدلے گھاٹ سے پیاس بجھانے والے متاخر کی روایت کو صاف شفاف سمجھ لیتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ آپ علم میں روایۃً اور درایۃً ماہر اہلِ مذہب علماء، خواہ وہ کتنی ہی قدر ومنزلت کے حامل ہوں، کے بیان کردہ ایسے مضبوط ومستحکم اصولوں، کہ جنہیں اپنانے سے متاخرین کی مخالفت ممکنہ حد تک کم ہو سکتی ہو، اور وسعتِ اطلاع سے کورے، ناتجربہ کاروں کے بیان کردہ کثرتِ اضطراب سے بھرے ہوئے ایسے اصولوں، جو کہ مذہب کے پابند متاخر علماء کی بہت زیادہ مخالفت کو مستلزم ہوں، کے درمیان تمیز بھی نہیں کر پاتے۔

انہی قابلِ گرفت باتوں میں سے آپ کا اصولِ مذہب میں تحکّم اور دھونس جمانا اور یہ کہنا ہے کہ: ایسا تو متاخرین کے ہاتھوں بھی ہوا ہے۔

مزید برآں آپ کا خبرِ واحد کے ذریعے نص پر زیادتی کرنا بھی اسی صف میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے اس......

......موضوع پر امام شافعی کا امام محمد رحمہما اللہ سے ہونے والا مناظرہ بھی ذکر کیا ہے، جو ایک تو ان کے مذکورہ بالا دعوے کی نقیض ہے، اور دوسرے اس کے بھی بالکل خلاف ہے جس کو ایک لحظہ قبل ہی مستحکم و مضبوط بنا رہے تھے۔ یہ سب باتیں اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ باتوں کی تہہ تک کتنا پہنچ پاتے تھے۔ اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا دائرۂ اطلاع بہت چھوٹا تھا، اور متقدمین کی ان کتب کے بارے میں آپ کو کچھ خبر نہیں تھی جن میں ہمارے ائمۂ قدماء سے منقول مذہب کے اصول جابجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو عیسیٰ بن ابان کی "الحجج الکبیر" اور "الحجج الصغیر"، ابوبکر رازی کی "الفصول في الأصول"، اتقانی کی "الشامل" اور کتبِ ظاہر الروایۃ کی شروح کی اطلاع کہاں ہو سکی ہوگی؟ حالانکہ ان کتب میں ہمارے ائمہ سے منقول، مذہب کے بہت سارے اصول موجود ہیں۔ چنانچہ اس موضوع میں آپ پر اعتماد کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آپ کی قابلِ مؤاخذہ باتوں میں سے ایک آپ کا "قِدَمِ عالَم" کا قائل ہونا بھی ہے۔ جیسا کہ محقق کشمیری نے "فیض الباري" کی کتاب "بدءُ الخلق" میں شاہ صاحب کے بعض رسائل سے اسے نقل بھی کیا ہے۔ اور یہ انتہا درجے کی خطرناک بات ہے۔

اور تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ: انہوں نے اپنے اس موقف پر، سنن ترمذی میں موجود، ابو رزین کی "عماء" والی حدیث سے استدلال بھی کیا ہے۔ اور حدیث کے راوی نے اس کا جو معنیٰ بیان کیا ہے، اس سے بالکل اعتناء نہیں کیا۔

مزید یہ کہ: اس حدیث کی سند میں "حماد بن سلمہ" اور "وکیع بن حدس" ہیں۔ حماد کے ہاں تو اختلاط پایا جاتا ہے۔ ان کے دونوں سوتیلے بیٹوں نے تشبیہ کے بارے میں اباطیل کو ان کی کتب میں جیسے جی چاہا، داخل کر دیا۔ اور امام بخاری نے ان سے بالکلیہ، جب کہ امام مسلم نے ثابت کے علاوہ دوسروں سے مروی روایات میں پرہیز کیا ہے۔ اس کا شیخ یعنی "یعلیٰ بن عطاء" کوئی اتنا خاص قوی راوی نہیں ہے۔ اور "وکیع بن حدس"، یا "عدس" (علیٰ اختلاف الآراء) مجہول الصفۃ آدمی ہے۔ اور اس جیسے آدمی کی روایت سے عورتوں کے حیض کے مسائل میں بھی احتجاج درست نہیں ہے، تو اس جیسے آدمی کی خبر میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی کہ عقائد کے باب میں، اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے، یا اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب کے بالکل منافی قِدَمِ عالَم کے عقیدہ کے اثبات کے لیے حجت بن سکے۔

حدیث نبوی کے بارے میں جس شخص کی بضاعتِ علمی اس قدر ہو، احکام کے دلائل کے باب میں اس شخص سے فیصلہ کیسے کروایا جا سکتا ہے؟ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ: آپ بعد میں اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ گئے تھے، اور ان مبشرات کی وجہ سے، جنہیں مدینہ منورہ میں دیکھا تھا، آخر میں جادۂ حق کی طرف لوٹ آئے تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب "فیوض الحرمین" (ص ٤٨) میں رقم طراز ہیں:

"مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ بات جتلا دی تھی کہ مذہب حنفی بہت مرتب، باسلیقہ اور پسندیدہ مذہب ہے۔ اور یہ سنت کے طرق کے سب سے زیادہ موافق ہے ...."

بہر حال، جو لوگ شاہ صاحب کی کتابوں "الإنصاف"، "عقد الجید"، اور "حجۃ اللہ البالغۃ" وغیرہ کے حوالے دے دے کر مذہب حنفی کو منہدم کرنے کی سعی کر رہے تھے، ان کی تمنا خاک میں مل گئی۔ اس مقام پر، ان کی شطحیات پر متنبہ کرنے کے لیے انہی سرسری اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیقِ ارزانی ملے تو کسی دوسری فرصت میں اس بکھری پھیلی بحث کے بارے میں آراء کی چھان بین کی

جائے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ.

صحیح اور سقیم میں سے کسی ایک صحیح کی تمیز کا ملکہ، مستقیم ذہن، سلامتی طبع، غلطی کی طرف طبیعت کا میلان نہ ہونا اور تھوڑی سی تنبیہ اور اشارے سے ہی صحیح بات کو قبول کر لینا ایسی صفات ہیں جو نعمت عظمی، دولت کبریٰ اور بہت بڑی عطاء ہیں۔ دنیا میں علم کے گھاٹ تو بہت سے ہیں، لیکن جو چیز نہایت ہی نادر ہے وہ مذکورہ بالا ملکہ کا حاصل ہونا ہے، کہ یہ تو بالکل ہی کبریت احمر ہے۔ شعر:

رَسَائِلُ إِخْوَانِ الصَّفَاءِ كَثِيْرَةٌ وَلٰكِنَّ إِخْوَانَ الصَّفَاءِ قَلِيْلُ (۸۶)

اہل صفا (یعنی صاف باطن والوں) کے رسائل تو بہت سے ہیں، لیکن خود اہل صفا (یعنی صاف باطن والے) بہت ہی تھوڑے ہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مِرْقَاةُ الْمَفَاتِيْحِ" میں جمیع شروح وحواشی کو جمع کر دیا ہے، اسی لیے ان کی یہ شرح حدیث کے معارف ومسائل کی فہم اور اس میں رسوخ حاصل کرنے کے لیے تمام کتابوں کی جامع اور نافع ترین شرح شمار کی جاتی ہے۔

ہمارے پیش نظر یہاں ایک تو یہ ہے کہ علماء متاخرین نے اپنی کتب میں انتخاب احادیث اور ان کی تبویب کا جو کام کیا ہے اسے سامنے لائیں۔ اور دوسرے وہ انتہائی عظیم الشان کام جو علامہ بغوی نے "مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ" کے نام سے کیا اور خطیب عمری نے اس کی اصلاح واستدراک کے بعد اس کا نام "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْحِ" رکھا ہے، ان کے بارے میں اور ان دونوں کتابوں (یعنی مَصَابِيْحُ السُّنَّة اور مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْحِ) کے بارے میں بتائیں۔ مزید برآں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی شرح کی کچھ ایسی خصوصیات ذکر کریں جو اس کتاب کا امتیاز ہیں۔ اس قدر تفصیلی گفتگو اس لیے ناگزیر ہے تاکہ علماء متاخرین کی امتیازی خدمات عموماً، اور ملا علی قاری کی امتیازی خدمات خصوصاً نکھر کر سامنے آجائیں۔

ہم کہتے ہیں کہ مسانید اور ابواب فقہ کی صورت میں سنت کی تدوین، اور کتابی صورت میں جمع حدیث کے فوراً بعد کے زمانے میں حدیث کی ترتیب وتہذیب کا عظیم کام وقوع پذیر ہوا، اور اسی کے ساتھ متقدمین کا زمانہ گزر گیا۔ بعد ازیں پانچویں صدی شروع ہوئی جو کہ متاخرین کے زمانے کی ابتدا ہے۔ اس دور میں مشرق ومغرب سے روایت ودرایت کے ماہر فقہاء محدثین کی ایسی جماعتیں اٹھیں جنہوں نے تلخیص متون اور خوبصورت انداز میں ان کی کانٹ چھانٹ کا کام کیا۔ اور اپنی ان خدمات میں انوکھی طرز، حسن ترتیب، تہذیب واختصار، استنباط احکام اور شرح غریب کے علاوہ ان تمام عصری تقاضوں کو مدنظر رکھا، جن کی رعایت، زمانے کے کروٹ لینے کی وجہ سے ضروری ہو جایا کرتی ہے۔ چنانچہ تدوین وتہذیب حدیث کے اس تاریخی موڑ پر وہ محدثین تمام ضروری اور مناسب تدبیروں کو بروئے کار لائے۔ اور اس نہج پر تدوین حدیث کا کام تسلسل سے جاری رہا۔

خدمت حدیث کے جویا، ماہر محدثین میں سے ایک ایسی جماعت سامنے آئی جنہوں نے امام بخاری اور امام مسلم کی دونوں کتابوں کو جمع کیا، اور انہوں نے ان کی کتابوں کے ابواب کی ترتیب چھوڑ کر، انہیں مسانید پر مرتب کیا، جیسا کہ ابو مسعود ابراہیم بن محمد دمشقی (ت ۴۰۱ھ) اور ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر حمیدی (ت ۴۸۸ھ) نے یہ کام کیا ہے۔

۸۶: دیکھیے: "الحطّة في ذكر الصحاح الستة، للقنوجي" (ص ۵۸، المطبعة النظامية، كانپور، هند ۱۲۸۳هـ)

اور انہیں محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے اصول ستہ (یعنی تین صحیح کتابیں: بخاری، مسلم اور موطأ، اور تین سنن: یعنی سنن ابو داؤد، سنن ترمذی اور سنن نسائی) کو جمع کیا۔ اور یہ کام ابوالحسن رزین بن معاویہ عبدری اندلسی (ت ۵۳۵ ھ) نے اپنی کتاب "التَّجْرِيْد لِلصِّحَاحِ وَالسُّنَنِ" میں کیا ہے۔

اور انہیں محدثین میں ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے آداب واخلاق اور ترغیب وترہیب کی احادیث کو جمع کیا، جیسے امام اسماعیل بن محمد اصبہانی (ت ۵۳۵ ھ) اور حافظ عبد العظیم منذری (ت ۶۵۶ ھ)۔

اور انہیں محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے احادیث کو اوائل کلمات میں آنے والے متشابہ حروف کی ترتیب پر مدون کیا ہے، جیسا کہ قاضی ابو عبداللہ محمد بن سلامہ قضاعی شافعی (ت ۴۵۴ ھ) نے اپنی کتاب: "شِهَابُ الأَخْبَارِ فِي الحُكَمِ وَالآدَابِ" میں، اور امام ابو العباس احمد بن معدّ أقليشي (ت ۵۵۰ ھ) نے اپنی کتاب: "النَّجْمُ مِن كَلَامِ سَيِّدِ العَرَبِ وَالعَجَمِ" میں کیا ہے۔ مؤخر الذکر نے اپنی کتاب کو دس ابواب پر مرتب کیا ہے، اور دسواں باب نبی اکرم ﷺ سے منقول اَدعیہ کے بیان کے لیے مختص کیا ہے۔ مزید اس موضوع پر علامہ حسن بن محمد صغانی لاہوری (ت ۶۵۰ ھ) نے "مَشَارِقُ الأَنوَارِ النَّبَوِيَّة" مرتب کی ہے۔

اور ان محدثین میں سے ایسے بھی ہوئے ہیں جو احادیث کو اخلاق وصفات کے اعتبار سے لائے ہیں، جیسے امام محیی الدین ابوزکریا یحییٰ ابن شرف النووی (ت ۶۷۶ ھ) نے اپنی کتاب "رِيَاضُ الصَّالِحِين" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے احکام کی احادیث کو یکجا کرنے پر اکتفا کیا ہے، جیسا کہ حافظ علامہ عبد الحق بن عبد الرحمن ازدی اشبیلی مالکی معروف بابن خرّاط (ت ۵۸۱ ھ) نے اپنی کتاب "الأَحكَامُ الصُّغْرىٰ" میں اور شیخ تقی الدین عبد الغنی بن عبد الواحد مقدسی (ت ۶۰۰ ھ)، اور شیخ الاسلام مجد الدین عبد السلام بن عبد اللہ الحرانی (ت ۶۷۱ ھ) نے اپنی کتاب: "المُنْتَقىٰ مِنَ الأَحكَامِ الشَّرعِيَّةِ مِن كَلَامِ خَيرِ البَرِيَّةِ" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے ازمنہ اور اوقات کے اعتبار کے احادیث کو جمع کیا ہے، جیسا کہ امام نووی نے اپنی کتاب: "الأَذْكَارُ المُنْتَخَبَةُ مِن كَلَامِ سَيِّدِ الأَبْرَارِ ﷺ" میں کیا ہے۔

اور انہی محدثین میں سے ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے متفرق ابواب جیسے عقائد، احکام، سیَر، آداب، فتن، اشراط ساعت اور مناقب کی احادیث کا استخراج کیا ہے جیسا کہ امام محیی السنہ محدث فقیہ شیخ حسین بن مسعود فرّاء (ت ۵۱۶ ھ) نے اپنی کتاب "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" میں کیا ہے۔

اور انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ان جہابذہ محدثین نے اپنی محنتوں کے دائرہ ءکار کو حدیث نبوی کی کسی ایک خاص نوع کے ساتھ مخصوص کر لینے پر اکتفا کر لیا۔ اور اگر چہ ان کتب کی شرح وتشریح کا بیڑہ بڑے علماء نے اٹھایا، لیکن اس تحدید کی وجہ سے ان کی کتب کا رواج اور چلن صرف ایک محدود اور مختصر دائرے تک محدود ہی رہا۔ بخلاف ان متقن محدثین کی کتابوں کے، جنھوں نے کسی ایک نوع کو چھوڑ کر کسی نوع کی تقیید، یا ایک صنف کو چھوڑ کر دوسری صنف کی تخصیص کیے بغیر، عوامی صورت میں پیش کر کے، حدیث نبوی کی بنیادوں کو استوار

کیا۔ اور حدیث شریف کے باب میں ان کی شہرت اور ان کی کتب کے پھیلاؤ کا راز، ان کی یہی عمومیت اور ہمہ گیریت تھی۔

چنانچہ اس عمومی طرز پر کام کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلے، اور سب سے مشہور محدث محی السنۃ امام محدّث فقیہ حسین بن مسعود فرّاء بغوی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "مَصَابِیْحُ السُّنَّة" میں متفرق ابواب سے احادیث کا انتخاب کیا ہے اور اسے بہت ہی بھلے اور خوبصورت نظم و نسق اور دلچسپ طرز سے ایسے مرتب کیا ہے کہ یہ کتاب دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور اہل فراست کی نگاہوں کو بھلی لگتی ہے۔ اس کتاب کے بعد جتنی بھی کتب نے شہرت پائی ہے یا تو اسی کے اختصار کی وجہ سے پائی ہے، یا کسی اور طرز کی وجہ سے پائی ہے تو وہ "مَصَابِیْحُ السُّنَّة" کے نہ تو برابر ہو سکتی ہیں اور نہ اس کے قریب۔

آئندہ سطور میں محی السنۃ علاّمہ بغوی نے اس بارے میں جو لکھا ہے، وہ ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

یہ کتاب ان الفاظ کا مجموعہ ہے جو علوم و معارف سے پُر سینۂ نبوی ﷺ کے چشمہ سے ابلے ہوئے ہیں، اور ان سنتوں کا بیان ہے جن کا منبع چشمۂ رسالت ہے، اور یہ سید المرسلین اور خاتم النّبیین ﷺ سے مروی احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ احادیث گھٹاٹوپ اندھیرے کے لیے چراغ (۸۷) ہیں، جو تقوی و طہارت کے طاقچہ سے نکلی ہیں۔ اور ان کا ماخذ ائمہ محدثین کی وہ کتب ہیں جن میں انہوں نے ان احادیث کو (سند کے ساتھ) درج کیا ہے۔ میں نے اس مجموعۂ احادیث کو عبادت کے لیے یکسو ہو جانے والے لوگوں کے لیے جمع کیا ہے، تاکہ یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالی کی کتاب کے بعد سنت کا ذخیرہ بنے۔ اور جس اطاعت میں وہ مشغول ہوئے ہیں، اس میں ان کا مدد گار ہو۔

میں نے اس مجموعے میں احادیث کی سندوں کا ذکر ایک تو اس لیے نہیں کیا کہ کتاب لمبی نہ ہو جائے، اور دوسرے اس لیے کہ میں نے ان ائمہ کی نقل پر اعتماد کیا ہے جنہوں نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں سند کے ساتھ درج کیا ہے۔ اور بعض جگہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کرنے والے صحابی کا نام کسی ضرورت کی وجہ سے درج کر بھی دیا ہے۔ اور تم دیکھو گے کہ: ہر باب کی احادیث دو قسم کی

۸۷: مصطفیٰ بن عبداللہ حاجی خلیفہ (ت ۱۰۶۷ھ) نے اپنی کتاب "كشف الظنون عن أسامي الكتب والفنون (۲: ۱۶۹۸ طبع استنبول ۱۳۶۲ھج) میں کہا ہے:

کہا گیا ہے کہ: مؤلف نے اس کتاب کا نام "المصابیح" نہیں رکھا تھا بلکہ غلبہ استعمال کی وجہ سے یہ نام اس کا علم بن گیا تھا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ: آپ نے ابتداءِ کتاب میں خطبہ اور "امّا بعد" کہنے کے بعد:

"إن أحاديث هذا الكتابِ مصابيحُ ..."

(کہ اس کتاب کی احادیث چراغ ہیں ...) کہا تھا۔

اس کتاب میں مذکورہ احادیث کی تعداد چار ہزار چار سو چوراسی حدیثیں ہے۔ ان میں سے حسن درجے کی احادیث دو ہزار پچاس حدیثیں ہیں۔ "ابن ملک"۔

نوٹ: صاحب مرقات (۱: ۱۰) کا کہنا ہے کہ: کہا گیا ہے کہ: اس کتاب کی احادیث کی تعداد چار ہزار چار سو چونتیس حدیثیں ہے۔

ہیں۔ ایک تو صحاح اور دوسری حسان۔

صحاح سے میری مراد وہ احادیث ہیں جنہیں شیخین یعنی ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل جعفی بخاری، اور ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری - رحمہما اللہ تعالی - نے اپنی اپنی جامع اور صحیح میں درج کیا ہے، یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

اور حسان سے میری مراد وہ احادیث ہیں جنہیں ابوداود سلیمان بن اشعث سجستانی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی وغیرہ ائمۂ حدیث نے اپنی اپنی تصانیف میں درج کیا ہے۔ (۸۸)

---

۸۸ : یہ مزید ایک ایسی اصطلاح ہے جو انہی کے ساتھ خاص ہے۔ علامہ محمد بن اسماعیل امیر (ت ۱۱۸۲ھ) نے اپنی کتاب "توضيح الأفكار لمعاني تنقيح الأنظار" (۱ : ۱۱٦، طبع قاهرة ۱۳٦٦هج) میں کہا ہے:

"صحیح اور حسن حدیث کے بارے میں، "المصابيح" میں بغوی نے ایک خاص اصطلاح استعمال کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ: صحیح حدیث وہ ہے جسے شیخین نے، یا ان میں سے کسی ایک نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہو۔ اور حسن وہ حدیث ہے جسے ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے روایت کیا ہو۔ حافظ ابن صلاح اور نووی وغیرہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ: صحاح کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی کتب میں مروی شدہ احادیث کے ساتھ خاص کرنا، اور حسان کو امام ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت کردہ احادیث کے ساتھ خاص کرنا ایک ایسی اصطلاح ہے جو معروف نہیں ہے۔ بلکہ یہ صواب کے خلاف بھی ہے۔ اس لیے کہ علم حدیث کے ماہرین کے نزدیک "حسن" ان احادیث سے عبارت نہیں ہے، جنہیں انہوں نے ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ کتب سنن میں بہت سی صحیح احادیث بھی موجود ہیں، اور بہت سی ضعیف روایات بھی موجود ہیں"۔

تاج تبریزی نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ: یہ اعتراض بھی عجیب ہے۔ اس لیے کہ ارباب علوم نقلیہ وعقلیہ کے ہاں یہ مشہور اور طے شدہ اصول ہے کہ: اصطلاح میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اس لیے اب کسی شخص کی اصطلاح کا تخطئہ کرنا صواب طریق سے بہت دور ہے۔

اور ان کے علاوہ دوسرے بعض محدثین جیسے حاکم اور خطیب ہیں، انہوں نے اس کے لیے ایک اور اصطلاح اختراع کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سنن ابوداود، اور سنن نسائی میں موجود تمام احادیث پر صحت کا اطلاق کیا ہے۔ اور سنن نسائی کے بارے میں ان حضرات کی موافقت ایک جماعت نے کی ہے، جن میں ابوعلی نیشاپوری، ابواحمد بن عدی اور دارقطنی ہیں"۔

ابن حجر ہیثمی کی فہرست کی منتخب عبارت مکمل ہوگئی۔

میں نے یہ تمام تفصیل اس لیے نقل کی ہے تاکہ دیکھنے والا ترمذی کی تصحیح، بغوی کی تحسین یا مصنف وغیرہ کے بتائے ہوئے معنی کے اعتبار سے صحیح احادیث کی تحسین پر رک کر یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ: یہ سب ایسی احادیث ہیں جن کی تصحیح ائمہ میں سے ایک امام نے کی ہے۔ بلکہ ہر اس امام کی اصطلاح کا جاننا ضروری ہے جس نے ان سے پہلے بھی احادیث کو صحیح یا حسن کہا ہے۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ تبریزی نے علامہ بغوی پر جو اعتراض کیا ہے، اس کا تعقب حافظ ابن حجر (ہیثمی) نے خوب کیا ہے۔ اور ان کا مقصد اس سے یہی ہے کہ: یہ پتہ چل جائے کہ علامہ بغوی نے اپنی ایک اصطلاح ایجاد کی ہے کہ: سنن اربعہ کو "حسان" کا نام اس لیے دیتے ہیں تاکہ اس اصطلاح کی بدولت ہر ہر حدیث کے بعد یہ بتانے کی زحمت سے بچ جائیں کہ اسے "تمام اصحاب سنن" یا "بعض اصحاب سنن" نے ......

اس قسم میں اکثر احادیث ایسی صحیح ہیں جنہیں عادل راویوں نے عادل رُوات ہی سے نقل کیا ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس قسم کی احادیث علو درجہ میں، سند کی صحت کے اعتبار سے شیخین کی شرائط کو نہیں پہنچتیں۔ چنانچہ بہت سے احکامات اپنے ثبوت میں جن دلائل سے مزین ہیں وہ حسن درجے کی احادیث ہیں۔ اور اگر کسی حدیث میں ضعف ہے، یا وہ غریب ہے، تو میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اور میں نے منکر اور موضوع حدیث کو درج کرنے سے احتراز کیا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ، وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ۔ (۸۹، ۹۰)

یہی وہ اہداف ہیں جن کی رعایت کی وجہ سے فن حدیث کے ماہرین کے ہاں یہ کتاب انتہائی پسندیدہ، دلکش اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حسنِ ترتیب کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اس کتاب کی حسین تنسیق وترتیب، ابواب کے تنوع، اور صنعت کی جودتِ طبع کی تعریف، مشہور شیخ علامہ حافظ محمد بن عتیق بن علی تُجَيْبِي غَرْنَاطِي، معروف بہ لاردی (ت ۶۴۶ ھ) نے اپنی کتاب "أَنْوَارُ الْمَصَابِيْحِ فِي الْجَمْعِ بَيْنَ الْكُتُبِ السِّتَّةِ الصِّحَاحِ" کے مقدمے میں کی ہے، جہاں انہوں نے کتاب "مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ" کا اُن دوسری کتابوں سے مُقارنہ کیا ہے، جو حدیثِ نبوی شریف کے باب میں انوکھے طرز پر تصنیف کی گئی ہیں۔ چنانچہ موصوف کہتے ہیں:

''ابن اَثیر نے احادیث کو حروفِ تہجی پر مرتب کیا۔ صغانی، قضاعی اور اِقْلِیشِي نے کلمات کے اوائل میں آنے والے الفاظ متشابہات کے لحاظ سے مرتب کیا، جب کہ امام نووی اور مدینی وغیرہ نے احادیث کو اخلاق وصفات اور اوقات واَزمنہ کے اعتبار سے مرتب کیا۔ اور "مَصَابِيْحُ السُّنَّةِ" ترتیب کے اعتبار سے ان سب سے بہترین ہے، کیونکہ علامہ بغوی نے اس کتاب میں احکام کے دلائل ایسے

......روایت کیا ہے۔ اور ان کا کلام اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ: ''وہ ایسی اصطلاح ہے جو معروف نہیں ہے''۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی یہ کہہ دیا ہے کہ: ایک تو یہ اصطلاح ہے، اور دوسرے یہ کہ: وہ نئی ہے۔ پھر کہتے ہیں: اہلِ حدیث کے ہاں حسن ایسی احادیث سے عبارت نہیں ہے'' تا کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ ان کتب میں صرف ویسی حسن احادیث ہی ہیں جن کی تعریف پہلے گزری۔ پھر حافظ ابن حجر (ہیتمی) کہتے ہیں:

''خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: ہمیں یہ بات ہی تسلیم نہیں ہے کہ: بغوی نے گذشتہ تعریف والی حسن حدیث مراد لی ہے، اور نہ ہی ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ابنِ صلاح نے ان پر اعتراض کیا ہے''۔

۸۹ : علامہ ابراہیم بن عمر بقاعی شافعی (ت ۸۸۵ھ) رقم طراز ہیں:

''بغوی جن احادیث کو اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں، ان میں صحیح اور حسن کی وضاحت نہیں کرتے۔ وہ اکثر تو غریب حدیث کے بارے میں بتاتے ہیں اور کبھی کبھی ضعیف حدیث کے بارے میں''۔

شیخ احمد شاکر نے، ابنِ کثیر کی "الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث" (ص ۴۳، طبع قاهرة، ۱۳۷۰ هج) پر اپنی تعلیقات میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: موصوف نے اپنی کتاب کے خطبہ میں بھی کہا ہے: اس میں اگر کوئی ضعیف حدیث تھی تو میں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ انتہیٰ۔ تو یہ اعتراض تو اپنی جگہ باقی رہا کہ انہوں نے سنن میں موجود صحیح احادیث کو، ان میں موجود حسان کے ساتھ ملا جلا دیا ہے۔ اور گویا انہوں نے اس کی وضاحت کرنے سے اس لیے سکوت کیا ہے کہ احتجاج کی صلاحیت میں دونوں مشترک ہیں''۔

۹۰ : دیکھیے: مصابیح السنة (۱: ۲)، طبع بولاق، مصر ۱۲۹۴.

اسلوب سے درج کیے ہیں جنہیں فقیہ بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔اور تقاضائے علم کے موافق ترغیب وترہیب کے ابواب قائم کیے ہیں، اور عالم انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔اور اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ کسی باب کو اس کی جگہ سے بدل کر کسی دوسری جگہ منتقل کرے، تو اسے علامہ بغوی کی رائے کے موافق وضع کردہ جگہ کے سوا کوئی دوسری مناسب جگہ نظر نہ آئے گی۔

اس کتاب کی تعریف وتوصیف میں شاعر شیخ ابوتراب عبدالحئی بن حیدر نے چند اشعار کہے ہیں، جو یہ ہیں:

كتاب المصابيح الحسان صحاح مفاتيح خيرات لكل مغلق

منير لأحكام الشريعة كلها منار لمنهاج الهدى بالتحقيق

إمام لأقوال الأنام وأسوة به يستبين الحق من كل منطق

به أس أرباب العلوم مشيد به شمل أصحاب الهوى في التفرق

سعى في مصابيح الدُّجى نور قصده بتهذيب أحكام لكل موفق

ترجمہ: کتاب: "مَصَابِيحُ السُّنَّة" حسان اور صحاح احادیث کا مجموعہ ہے، جو کہ ہر قسم کی خیر کے بند دروازے کے لیے چابیاں ہیں ۔ یہ کتاب تمام احکام شریعت کو منور کرنے والی ہے، اور یقیناً ہدایت کے راستے کا مینار ہے۔علماء کے اقوال کو بیان کرنے میں اس کی حیثیت امام کی سی ہے۔اور یہ کتاب ایک ایسا نمونہ ہے جس کے ذریعے سے ہر قسم کے کلام سے حق پہچانا جاسکتا ہے۔ارباب علم نے اسی کتاب سے مضبوط ومحکم بنیادیں اٹھائیں، اور افتراق وانتشار میں پڑے ہوئے اہلِ حرص وہوا کے لیے یہی کتاب اجتماعیت اور شیرازہ بندی کا ذریعہ ہے۔گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس کتاب کے نور نے ہر توفیق یافتہ کے لیے احکام کی تہذیب کی کوشش کی ہے۔

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ابواب کے تنوع، جودت ترتیب اور وسعت مواد کی وجہ سے علامہ بغوی کے معاصرین میں سے کسی کی کتاب ان کے ہم پلہ نہیں سمجھی گئی۔امام فراء کی کتاب: "المَصَابِيح"، علاّمہ بغوی کی کتاب کے مقابلے میں بالکل اس چلتی ہوئی مثال کی سی ہے کہ "كُلُّ الصَّيْدِ فِي جَوْفِ الْفَرَاءِ" (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شکار گورخر سے کم تر ہے)۔ چنانچہ "مَصَابِيحُ السُّنَّة" کو اہلِ نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے، اور علماء امصار نے مطالعہ کرنے، پڑھنے، پڑھانے، تلخیص وشرح اور تعلیق وغیرہ مختلف جہات سے اس کتاب کی خدمت کی ہے۔اسی لیے یہ کتاب مختلف علاقوں میں ایسے ہی پھیل گئی ہے، جیسا کہ سورج کی دھوپ دوپہر کو پھیل جاتی ہے۔

سب سے پہلے جس نے اس کتاب کی تلخیص کی، وہ علامہ بغوی کے شاگرد عارف فقیہ شیخ ابونجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردی ہیں، جن کی وفات ۵۶۳ھ میں ہوئی۔

اور سب سے پہلے جس نے اس کی شرح کی، وہ علامہ امامِ سنّت شیخ شہاب الدین فضل اللہ تورپشتی حنفی تھے۔انہوں نے اپنی شرح کا نام: "المُيَسَّر" رکھا تھا، اور ۶۶۱ھ میں اپنی یہ شرح مکمل کرلی تھی۔پھر ان کے بعد قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمر بیضاوی (ت ۶۸۵ھ) نے "تُحْفَةُ الأَبْرَار" نامی شرح لکھی، اور فضل اللہ تورپشتی کے شاگرد شیخ صدرالدین ابوالمعالی مظفر عمری (ت ۶۸۸ھ) نے ایک شرح لکھی جس کا نام "اَلتَّلْوِيح فِي شَرْحِ المَصَابِيح" رکھا۔اور ابوالفرج محمد بن داود بن یوسف تبریزی نے اس کی شرح سے ۶۸۰ھ

میں فراغت پائی۔

یہاں ہم نے صرف ان علماء کے نام ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے جنہوں نے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں، شرح یا تلخیص کی صورت میں اس کتاب کی خدمت کی ہے۔ ورنہ اس کتاب کی شرح تعلیق، ترتیب، تہذیب اور تنقیح کی صورت میں اس کتاب کی خدمت کا سلسلہ گیارہویں صدی ہجری تک چلتا رہا ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ کی کتاب "كَشْفُ الظُّنُوْنِ عَنْ أَسْمَاءِ الْكُتُبِ وَالْفُنُوْنِ" میں اس کی تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

انہی وجوہات کی بنا پر اس کتاب کی شہرت آفاق میں پھیل گئی، اور اہل عجم نے تو اسے خوب ہی مضبوطی سے پکڑ لیا، اور ان کا گمان یہ ہوگیا تھا کہ: ''جو اس کتاب کو امعان نظر سے پڑھے گا، تو وہ محدثین کے درجہ تک جا پہنچے گا''۔ چنانچہ تاج الدین عبدالوہاب سبکی (ت ۷۷۱ھ) اپنی کتاب "مُعِيْدُ النِّعَمِ وَمُبِيْدُ النِّقَمِ" میں اس نظریہ کا تعقُّب کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اور ان علماء میں ایک طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جن کا منتہائے نظر صاغانی کی "مَشَارِقُ الْأَنْوَار" ہے۔ اور اگر زیادہ ہی نظر بلند کریں تو بغوی کی "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" تک نگاہ جاتی ہے اور بس۔ اور ان کا گمان یہ ہے کہ: اسی قدر علم حدیث حاصل کرنے سے محدثین کے درجہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اور ان کا یہ گمان، حدیث سے ان کی جہالت کی وجہ سے ہے۔ (ایضًا ص ۱۶۹۸)

جس قسم کے لوگوں کا ہم نے تذکرہ کیا ہے، اگر یہ لوگ ان دونوں کتابوں کو زبانی یاد کرلیں، اور اسی قدر متون مزید بھی اس کے ساتھ شامل کرلیں، تو نہ تو وہ محدّث ہوں گے، اور نہ اس طرح آئندہ کبھی محدّث ہوسکیں گے، حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے''۔ (۹۳)

اور آٹھویں صدی ہجری میں جب علامہ شرف الدین طیبی نے ایک ایسی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں منتخب اور صحیح احادیث ہوں، تو انہوں نے علامہ بغوی کی "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" کو مختصر اور لوگوں کے لیے بہت مفید اور ان کے ہاں مقبول پایا۔ غور وفکر کے بعد، اس میں کمی دیکھتے ہوئے اس پر مزید ایک ذیل لکھنے کی ضرورت کو محسوس کیا تو اپنے شاگرد خطیب تبریزی سے اس بارے میں مشورہ کیا، اور دونوں استاد وشاگرد اس کتاب کی اصلاح، تہذیب اور تذییل پر متفق ہوگئے۔ اور خطیب تبریزی نے اس میں خوب جان کھپائی، حتیٰ کہ اس کام کو مکمل کر کے اپنے شیخ علامہ طیبی کے سامنے پیش کیا، تو انہوں نے اسے بنظرِ استحسان دیکھا، اور بہت پسند کیا۔

اور اسی صدی میں ان کے ایک معاصر علامہ صدر الدین ابو عبداللہ محمد شرف الدین بن ابراہیم سلمی مناوی شافعی (ت ۷۴۸ھ) نے "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" کی اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے، اس کی احادیث کی تخریج، ہر حدیث کی اس کے مخرج کی طرف نسبت اور شرح کرنے کا بیڑہ اٹھایا، چنانچہ اپنی کتاب "كَشْفُ الْمَنَاهِجِ وَالتَّنَاقِيْحِ فِي شَرْحِ أَحَادِيْثِ الْمَصَابِيْحِ" میں کہتے ہیں:

"مصابیح السُّنۃ" ایسی کتاب ہے کہ جس کی طرف بڑے بڑے عبادت گزار بندے متوجہ ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے پیش نظر اختصار تھا لہٰذا انہوں نے بہت سے صحابہ کرام، اور اخبار وآثار کے رُوات کے حالات زندگی ذکر نہیں کیے، اور نہ ہی ان اخبار وآثار کی تخریج کی

۹۳: دیکھیے: "معيد النعم ومبيد النقم" (ص ۸۱، القاهرة ۱۳۶۷هج).

ہے۔ بلکہ ایک نئی اصطلاح قائم کی کہ: صحاح (یعنی صحیح حدیثیں) وہی ہیں جو صحیحین، یا ان میں سے کسی ایک میں ہوں۔ اور حسان (یعنی حسن حدیثیں) وہ ہیں جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی نہ ہوں۔ موصوف نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ جو حدیث ضعیف ہو، اس کے ضعف پر متنبہ کر دیں، اور جو منکر اور موضوع حدیث ہو، اسے ذکر نہ کریں، اور (اگر کہیں ذکر ہو جائے تو) اس کی طرف اشارہ نہ کریں۔ چنانچہ اس التزام کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے صحیح احادیث بھی نقل کی ہیں، اور وہ بھی جو صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی نہیں ہیں۔ اور حسن احادیث بھی نقل کی ہیں۔ اور اس قسم کے مجموعے میں وہ احادیث بھی ہیں جو صحیحین میں سے کسی ایک کتاب میں ہیں۔ اور موصوف نے حسان میں ایسی احادیث بھی داخل کر دی ہیں جو ضعیف اور واہی ہیں، اور ان پر متنبہ بھی نہیں کیا۔ اور بعض اوقات ایسی موضوع احادیث بھی ذکر کر دی ہیں جو درجۂ سقوط کے لحاظ سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی اس کتاب کا موضوع ہی یہ قرار دیا ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کروں، اور حدیث کی نسبت اصحاب کتب میں سے اس کے مخرج کی طرف کر دوں۔ اور اگر حدیث کتب ستہ میں سے کسی میں بھی موجود نہ ہو، تو اس کی تخریج ان کے علاوہ مسند شافعی اور موطأ امام مالک وغیرہ جیسی دوسری کتب سے کروں''۔

(دیکھئے: ''کشف الظنون'' (۲: ۱۷۰۰)۔)

شیخ سلمی اگر متن کی اصلاح کرتے اور اسی پر استدراک کرتے، تو اس کا نفع عام اور تام ہو جاتا، جیسا کہ ان کے معاصر خطیب عمری نے کیا ہے، اور خطیب اسی وجہ سے مشہور بھی ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب ''مَصَابِیح'' کی اصلاح اور تہذیب کی اور ذیل کے طور پر اس میں (بابِ ثالث کا) اضافہ بھی کیا، اور اس کا نام ''مِشْکَاۃُ الْمَصَابِیْح'' رکھا۔ شیخ ابوبکر زہیر شاویش نے ''مشکاۃ المصابیح'' پر جو مقدمہ لکھا ہے، اس میں اس کتاب کے مقدمے کی بڑی اچھی تلخیص کی ہے۔ اس کی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

''کتاب کے شروع میں جو مقدمہ آپ مصنف کے قلم سے پڑھیں گے اس میں خطیب نے ہمیں ''مِشْکَاۃ'' کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اہم کام جو انہوں نے اس کتاب میں کیے ہیں یہ ہیں کہ: صاحبِ ''مَصَابِیْح'' جن باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں، انہیں بیان کیا ہے۔ اور جن احادیث کو بلا سند چھوڑ دیا ہے، ان احادیث کے راوی کا نام اور حدیث کے مخرج کا ذکر کیا ہے۔ اور عموماً ہر باب کو تین فصول پر تقسیم کیا ہے:

پہلی فصل: (یہ فصل ''مصابیح'' میں علامہ بغوی کے کہے ہوئے قول: ''مِنَ الصِّحَاحِ'' کے بدل کے طور پر ہے) میں وہ احادیث ہیں جو شیخین کے، یا ان میں سے کسی ایک کے ہاں ہیں۔ اور خطیب تبریزی نے تخریج کرتے ہوئے روایت میں علوّ درجہ کی وجہ سے انہی دونوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اگرچہ اس میں ان کے علاوہ دوسرے محدثین اور مخرجین بھی شریک ہوں۔

دوسری فصل: (یہ فصل ''مَصَابِیح'' میں علامہ بغوی کے کہے ہوئے قول: ''مِنَ الحِسَانِ'' کے بدل کے طور پر ہے)، میں وہ احادیث ہیں جنہیں ان دونوں کے علاوہ دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے، اور وہ محدثین یہ ہیں: ابوداود، ترمذی، نسائی، دارمی اور ابن ماجہ۔ ''مَصَابِیْح'' کی احادیث ان نو ائمہ کی کتب سے باہر نہیں ہیں۔

تیسری فصل: مذکورہ باب کی مفید مطلب ایسی احادیث کے انتخاب پر مبنی ہے، جنہیں علامہ بغوی نے بعض مناسب ملحقات کی وجہ

سے ذکر نہیں کیا۔ خطیب نے ایسی احادیث کو زیادتِ فائدہ کے لیے اس باب کے ساتھ ملحق کر دیا ہے، اور اس میں علامہ بغوی کی شرط کی رعایت کرتے ہوئے حدیث کی نسبت راوی صحابی کی طرف بھی کی ہے، اور ائمہ متقدمین وغیرہ میں سے جس سے یہ حدیث لی ہے، اس کی طرف بھی نسبت کی ہے۔ اگر چہ صرف مرفوع احادیث کے انتخاب کا ویسا التزام نہیں کیا جیسا کہ علامہ بغوی نے کیا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے مصابیح کی احادیث پر پندرہ سو گیارہ حدیثوں کی زیادتی کی ہے۔ بہر حال، خطیب نے کتاب کی تہذیب کی، اور علامہ بغوی سے جہاں کہیں سہو ہو گیا تھا، اس پر استدراک کیا ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات علامہ بغوی کسی ایسی حدیث کو صحاح میں شمار کر لیتے ہیں جسے شیخین یا ان میں سے کسی ایک نے بھی روایت نہیں کیا ہوتا۔ اور بعض مرتبہ ایسی حدیث کو حسان میں ذکر کر دیتے ہیں جسے شیخین یا ان میں سے کسی نے روایت کیا ہوتا ہے۔ (دیکھئے:"مشکاۃ المصابیح"(ص ۵، دمشق ۱۳۶۱ ھج)۔)

موصوف کے اس طویل اور مشقت طلب کام کی وجہ سے کتاب ایسی مہذب، منقح، کامل اور کافی وافی صورت میں جلوہ گر ہوئی جس سے اخروی مقاصد اور ابدی سعادت کی تحصیل کی جا سکتی ہے۔ مشہور شیخ فقیہ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی "لَمْعَاتُ التَّنقِيحِ شَرْحِ مِشْكَاةِ المَصَابِيحِ" نامی شرح میں اس کتاب کی ایسی جامع تعریف کی ہے کہ اس کے بعد مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''شیخ ... تبریزی کی کتاب "مِشْكَاةُ المَصَابِيحِ" بہت پاکیزہ اور مبارک ہے۔ خلل وزلل سے پاک اور علم وعمل سے متعلق احادیث وآثار سے لبریز ہے۔ آں موصوف نے اس کی ترتیب وتہذیب اور تنقیح وتصحیح میں اتنی جان کھپائی ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دینی مطالب کے حصول اور اخروی مقاصد کے ادراک کے طالب کے لیے اس میں وہ تمام سامان موجود ہے جس کے ذریعے وہ کامیابی پا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش مقبول فرمائے، اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائے''۔

انہی خصوصیات کی وجہ سے "مشکاۃ" کا متن ایسی تمام خوبیوں کا حامل ہے جن کی بنا پر حسنِ تلقی اور قبولیت حاصل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے معقولات ومنقولات کے بڑے ماہر اور فاضل علماء نے اس کتاب کے پڑھانے، حفظ کرنے اور شرح کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے اس کتاب کی شرح کی، وہ مؤلف کے شیخ علامہ طیبی ہیں جنہوں نے بڑی تفصیلی شرح لکھی، اور اس کا نام "الكاشف عن حَقَائِقِ السُّنَن" ہے۔ موصوف نے کتاب کی خوبیوں، اس کے نکات ومحاسن، اور لطائفِ معانی کے استخراج پر خوب محنت کی ہے۔ ایسے ہی حدیث کے معارف وحقائق، فقہ الحدیث، اس کی باریکیوں اور درایتِ حدیث کے متعلقات پر بھی اچھی دادِ تحقیق دی ہے، چنانچہ ان کی یہ کتاب اپنے موضوع پر نادرِ روزگار شمار ہو کر مشہور ہوئی ہے۔ آئندہ سطور میں علامہ طیبی کی زبانی ان اسباب وعلل کا بیان ملاحظہ کیجیے جن کی بنا پر انہوں نے یہ شرح لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

حمد وصلاۃ کے بعد: اللہ کے کرم کا امیدوار بندہ حسین بن عبد اللہ بن محمد طیبی (اللہ اس کے اعمال کا خاتمہ بالخیر کرے) عرض پرداز ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے ساتھ توفیقِ ارزانی اور حسنِ عنایت کا معاملہ ہوا، بایں طور کہ باریکیوں میں غور وخوض کر سکوں اور چھپی باتوں کے چہرے سے نقاب اتار کر پھینک سکوں، اور اس کارگزاری کے ذریعے سے میں اللہ کے اس کلام مجید کے دقائق کی تحقیق

تک رسائی حاصل کرسکوں کہ جس کے نہ تو سامنے باطل ٹِک سکتا ہے، اور نہ ہی پیچھے سے حملہ آور ہو سکتا ہے، اور وہ کلام حکمت والے قابل تعریف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے میرے لیے اسے پورا کرنا آسان کر دیا، تو میری طبیعت میں اس بات کا داعیہ بڑی شدت اختیار کر گیا کہ میں اللہ کا تقرب بایں طور حاصل کروں کہ متقین کے امام، قائد غر المحجّلین، حبیب رب العالمین، سید المرسلین، خاتَمُ النَّبِیِّین - صلوات اللہ وسلامہ علیہ - کی احادیث کے بعض معانی بیان کروں اور ان کی تشریح کروں۔

اس سے پہلے میں نے اپنے ایک دینی بھائی، ایمان ویقین میں کامل، کلیجے کی ٹھنڈک، قطب الصلحاء، زاہدین وعابدین کے لیے باعث عزّ وشرف، یعنی شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب دامت برکاتہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تھا کہ احادیث نبوی علی صاحبہا افضل التحیۃ والسلام کا ایک مجموعہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ "مصابیح" کے تکملہ، اس کی تہذیب وتشذیب، اس کے رواۃ کی تعیین، اور ائمۂ متقنین کی طرف احادیث کی نسبت کر دینے کے کام پر ہمارا اتفاق رائے ہو گیا۔ جس نہج پر احادیث جمع کرنے کے خاکے کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا، اسے پورا کرنے میں خطیب نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری تمنا پوری کرنے میں وہ اپنی ہمت وطاقت کے بقدر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، اور جب انہوں نے اس کام کو پورا کر لیا، تو میں نے ائمہ کی طرف منسوب کتب کے تتبع کے بعد، اس کے معضلات کی شرح، مشکلات کے حل، طویل ابحاث کی تلخیص، غریب اللغۃ اور نحو کے لحاظ کے ساتھ ساتھ، علم معانی اور علم بیان کے تقاضوں کے مطابق اس کے نکات ولطائف بیان کرنے پر کمر ہمت باندھی۔ اللہ ان تمام ائمۂ کرام کی کوششوں کو ثمر آور بنائے۔

مزید یہ کہ مراجعت وتحقیق میں جو کتابیں میرے پیش نظر رہی ہیں، میں نے کسی علامت کے ذریعے ان کی نشان دہی بھی کر دی ہے، چنانچہ "مَعَالِمُ السُّنَنِ وأعلاَمُها" کے لیے (خط)، "شَرْحُ السُّنَّة" کے لیے (حس)، "شرح صحیح مسلم" کے لیے (مح)، زمخشری کی "الفَائِق" کے لیے (فا)، راغب اصفہانی کی "مُفْرَدَاتُ القُرآن" کے لیے (غب)، ابن اثیر جزری کی "النِّهَاية" کے لیے (نہ)، شیخ تورپشتی کے لیے (تو)، قاضی ناصر الدین کے لیے (قض)، "المظهر" کے لیے (مظ)، اور "الأشرف" کے لیے (شف) کی علامت استعمال کی ہے۔

ان کتب سے نقل کرنے میں میرا طریقہ اختصار کا رہا ہے، اور میرا زیادہ تر اعتماد امام مسلم کی کتاب صحیح کی امام نووی کی شرح پر رہا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہ کتاب اکثر فوائد کی جامع ہے۔ اور جس جگہ تمہیں کوئی علامت نظر نہ آئے، تو اس کا اکثر حصہ میرے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ اگر تمہیں اس میں کوئی خلل نظر آئے تو اسے ٹھیک کر دینا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اچھا بدلہ دے۔

اگر تم بنظرِ انصاف دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی تصنیف ایسی نہیں ہے جو سنت کے حقائق اور دقائق بیان کرنے میں اس قدر جامع اور تحقیقی ہونے کے باوجود اس قدر وجیز اور مختصر عبارات پر مشتمل ہو۔ میں نے اس کتاب کا نام: "الكَاشِف عَن حَقَائِقِ السُّنَن" رکھا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری اس کوشش کو خالص اپنی ذات کے لیے بنائیں، میری اس محنت کو قبول فرمائیں، اور اسے میرے لیے ذخیرہ کے طور پر جمع کر دیں، جس کا بدلہ مجھے آخرت کے گھر میں ملے۔ اس لیے کہ وہ تمام بھیدوں سے

واقف، اور دلوں کے پوشیدہ رازوں کو جانتا ہے۔ میں اسی پر توکل کرتا ہوں، اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں‘‘۔

میرزا محمد باقر خوانساری اصبہانی (ت ۱۳۱۳ھ) اپنی مشہور کتاب ’’رَوْضَاتُ الجَنَّات فِي أَحوَالِ العُلَمَاءِ وَالسَّادَات‘‘ میں رقم طراز ہیں:

من جملہ ان کی تصنیفات کے، ایک بڑی تفصیلی شرح علامہ حسین ابن مسعود بغوی کی ’’مصابیح‘‘ کی ’’مِشْكَاةُ المَصَابِيح، لِلخَطِيب تَبرِيزِي‘‘ نامی تہذیب پر ہے۔ انہوں نے اس کا نام ’’الكَاشِفُ عَن حَقَائِقِ السُّنَن‘‘ رکھا ہے، اور اس کے مقدمے میں علوم حدیث کے فوائد پر تفصیلی بحث کی ہے، اور سند و متن کے اعتبار سے حدیث کی تقریباً تیس کے قریب قسمیں کی ہیں۔ اور ان کے معانی کو بڑے واضح، کامل اور خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

محدث بارع، محقق مفضال شیخ محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب: ’’التعليق الصبيح على مشكاة المصابيح‘‘ میں لکھتے ہیں:

قسم بخدا! سنت کے حقائق و دقائق بیان کرنے، اس کے لطائف و معارف ظاہر کرنے اور اس کے اسرار و غوامض کھولنے میں اس سے زیادہ جامع تحقیق کتاب تمہیں نظر نہ آئے گی۔ انہوں نے کیسی ہی عجیب و غریب نادر المثال شرح لکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی شارح نے اس اسلوب پر شرح نہیں لکھی۔

میں کہتا ہوں: ان کے بعد جو بھی آیا ہے، اور اس نے فقہ الحدیث اور اس کے معانی کی شرح پر کلام کیا ہے، اس نے انہیں کے چشمے سے پانی پیا، اور انہیں کے انوار و برکات سے استفادہ کیا ہے‘‘۔

ہم نے اس کتاب ’’شَرحُ الطِّيبِي‘‘ کا ایک صحیح خوبصورت خطی نسخہ، سندھ میں پیر جھنڈو محب اللہ شاہ راشدی کے کتب خانہ میں دیکھا ہے، جو چوتھے صاحب علم ہیں۔ اور اس کتاب کی جلد اول کا ایک خوبصورت خطی نسخہ علامہ محدث بارع محقق مفضال سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کے پاس ہے، اور اس پر افغانستان کے مشہور علماء کی مہریں بھی ہیں۔ اس کتاب کا ایک اور خطی نسخہ مغربی پاکستان میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

پھر ان کے بعد علامہ سید شریف علی بن محمد جرجانی (ت ۸۱۶ھ) نے ’’مِشكَاةُ المَصَابِيح‘‘ پر بڑی اچھی تعلیق کی ہے۔ شیخ محمد عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’علامہ جرجانی کی تصانیف میں سے ایک ’’مشکاۃ‘‘ کا حاشیہ بھی ہے۔ یہ شرح، علامہ طیبی کے حاشیہ کا خلاصہ ہے، ہاں اس میں بعض جگہ چند چیزوں کی زیادتی بھی ہے، جب کہ ملا علی قاری نے اس بات کا کہ علامہ جرجانی کا کوئی حاشیہ ’’مشكاة المصابيح‘‘ پر ہے، انکار کیا ہے۔ چنانچہ ’’المِرقَاة شَرحُ المِشكَاة‘‘ میں جب یہ حدیث آئی ہے کہ: ’’رسول اللہ ﷺ ایک حلقے والوں کے پاس آئے اور ان سے پوچھا: تمہیں کس شے نے یہاں بٹھایا ہوا ہے‘‘؟ تو انہوں نے عرض کیا: ہم تو بس اللہ کا ذکر کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’کیا اللہ کی قسم! تمہیں بس اسی چیز نے بٹھا رکھا ہے... ؟ الخ۔

تو اس مقام پر ملا علی قاری لکھتے ہیں: "سید جمال الدین نے آپ ﷺ کے قول: "آللّٰہ" کو جر کے ساتھ پڑھا ہے، اور ان کے قول کی بنیاد محقق شریف جرجانی کا اپنے حاشیہ میں یہ کہنا ہے کہ: ہمزہ ءِ استفہام یہاں حرف قسم کے بدل کے طور پر آیا ہے، اور اس کی وجہ سے بھی جر دینا واجب ہوتا ہے"۔ اھ۔

اس بات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ طیبی کے مشکاۃ شریف کے حاشیہ کا خلاصہ محقق شریف جرجانی کے قلم سے ہے، اور یہ بات لوگوں میں مشہور بھی ہے۔ لیکن یہ بہت ہی بعید ہے۔

اولاً: تو اس لیے کہ اس خلاصہ کا تذکرہ ان کی تالیفات میں کہیں نہیں ہے۔

ثانیاً: اس لیے کہ اپنی جلالت شان کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ علامہ طیبی کی شرح کا بس ایک نرا اختصار ہی کریں، اس میں تفصیل و زیادت جیسا کوئی تصرف مطلقاً نہ ہو۔ جیسا کہ یہ بات کسی پر مخفی نہ ہوگی۔ ملا علی قاری کا کلام پورا ہوا۔

میں کہتا ہوں: ان کی یہ بات محل تأمّل ہے۔ اس لیے کہ ایک جماعت نے ان کی جانب اس حاشیہ کی نسبت کی ہے، جیسے حاجی خلیفہ "كَشْفُ الظُّنُونِ عَنْ أَسَامِي الْكُتُبِ وَالْفُنُونِ" میں، اور حافظ سخاوی، ابنِ سبطِ سید شریف سے نقل کرتے ہوئے "اَلضَّوْءُ اللَّامِع" میں رقم طراز ہیں:

"علی بن محمد بن علی سید الزین ابو الحسن حسینی جرجانی حنفی۔ اہل مشرق کے عالم تھے، اور سید شریف کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے نواسے کے بیٹے نے جب مجھ سے ۸۸۶ ھ میں علم حاصل کیا، تو اس نے ان کا نام و نسب یوں بیان کیا: علی بن علی بن حسین۔ لیکن مشہور نام و نسب پہلا ہی ہے۔ موصوف کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔

اس کے بعد علامہ جرجانی کے تحصیل علم کا تذکرہ ہے، پھر ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: مجھے ان کے نواسے کے بیٹے نے متعین طور پر بتایا کہ ان کی تصنیفات میں "تفسیر الزهراوین" ہے، ... اور تفسیر بیضاوی اور "مشکاۃ" میں سے ہر ایک کے حواشی ہیں، اور علم حدیث میں طیبی کا خلاصہ بھی ہے"۔

یہ ان کے پڑنواسے ہیں جو صاف طور پر یہ خبر دے رہے ہیں کہ: ان کا "مِشْكَاة" پر ایک حاشیہ بھی ہے۔ اس کی موجودی میں ملّا علی قاری کا یہ قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کا ذکر ان کی تصانیف میں نہیں ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ علم حدیث میں خلاصہ طیبی پر، اور ہدایہ پر ان کا حاشیہ ہے۔ لہٰذا جس کا گمان یہ ہے کہ سید شریف جرجانی کو فقہ و حدیث اور ان کے متعلق فنون سے کوئی مس نہ تھا۔ (دیکھیے: "الفوائد البهية مع التعليقات السنية" (ص ۱۳۱، مصر ۱۳۲۴)۔) اس کا قول باطل ہے۔ ہم نے اس کتاب کا ایک خطی نسخہ مغربی پاکستان کی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں دیکھا ہے۔

ان کے بعد محدث عماد الدین عبد العزیز بن محمد بن عبد العزیز ابہری (ت ۸۴۳ھ) نے "مشکاۃ" کی شرح کی، اور اس کا نام "مِنْهَاجُ الْمِشْكَاة عَلَىٰ مِشْكَاةِ الْمَصَابِيح" رکھا۔ اور یہ نام ہی اس کتاب کی تاریخ تالیف بھی ہے۔ چنانچہ حاجی خلیفہ نے کہا ہے: اور اس کی شرح عبد العزیز بن محمد بن عبد العزیز ابہری نے، جن کی وفات ۸۹۵ ھ کی حدود میں ہوئی ہے، امیر علی شاہ کی فرمائش پر

کی تھی، اور اس کا نام "منهاج المشكاة" رکھا، اور یہ اس کتاب کی تاریخ تالیف بھی ہے۔

مزید شیخ شمس الدین احمد بن سلیمان، شہیر بہ ابنِ کمال پاشا (ت ۹۴۰ ھ) اور حافظ ابن حجر ہیتمی مکی شافعی (ت ۹۷۳ ھ) نے بھی "مشکاۃ" کی شرح کی ہے، اور انہوں نے شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے شافعی مذہب کی تائید ونصرت کی انتہائی کوشش کی ہے۔ موصوف نے متن کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب "فَتْحُ الإلٰهِ فِي شَرْحِ المِشْكَاة" کے مقدمہ میں بایں الفاظ رقم طراز ہیں:

''فنون میں ابواب پر مرتب شدہ انداز میں کی جانے والی تالیفات میں سب سے زیادہ جامع، اور اہل علم کے لیے سب سے زیادہ نافع کتاب "مِشْكَاةُ المَصَابِيح" ہے، جو علامہ محقق ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی شافعی کی تالیف ہے۔ ان پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔ اور انہوں نے جس طرح "مَصَابِيحُ السُّنَّة" میں وارد شدہ احادیث کو جمع کیا، اس پر زیادات کیں اور ان کی تہذیب اور تخریج احادیث کی خدمت سرانجام دی، اس پر اللہ انہیں جزائے خیر دے اور ان کی اس محنت کو بارآور بنائے۔ ... اور میں نے عالی مطالب پر مشتمل مضامین کے تتمات کا بیان کیا، ....اور اس میں نادر قسم کے ایسے فوائد ہیں جن کے بیان کرنے میں منفرد ہوں، ... اسی وجہ سے ۹۵۴ ھ کے موسم حج میں مکہ معظمہ میں ماوراء النہر کے بعض فضلاء وصلحاء، اور محققین وراسخ علماء کی ایک جماعت نے مجھ سے یہ کہا کہ: میں اس کتاب کی ایک ایسی معتدل ومتوسط شرح لکھوں جو نہ تو بہت مختصر ہو، اور نہ ہی بہت طویل ہو، تا کہ اس کتاب کا نفع عام ہو جائے۔ اور لوگ اس کی وجہ سے دارین میں خیر حاصل کر سکیں۔

اور وہ حضرات جنہوں نے اس کتاب (یعنی "مشكاة المصابيح")، اور اس کی اصل (یعنی "مصابيح السُّنّة") پر لکھا ہے۔ انہوں نے ابحاث کو بہت زیادہ پھیلا دیا، شرح کے مقصد سے دور نکل گئے، اور حد سے زیادہ تفصیل میں پڑ گئے، اور اس سب کے باوجود بھی انہوں نے فقہ الحدیث اور اس کے معانی پر سیر حاصل بحث نہیں کی، ... اور نہ ہی قابل ترجیح فروع کی تحقیق پر کما حقہ توجہ دی، تو اس جیسی چال چلنے سے میں نے باز رہنے کا ارادہ کر لیا، ... میں ایک قدم آگے بڑھاتا اور دوسرا پیچھے ہٹا لیتا۔

اور یہ کتاب ایسی ہے کہ ابھی تک کسی فقیہ نے اس کے چراغ کو روشن ہی نہیں کیا، نہ ہی اس کے اسلوب کو واضح کیا، ... پھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے جنہوں نے اس کتاب کی شرح لکھنے پر ابھارا، اگرچہ اس وقت اس راہ کی دشواریوں کے باعث ایسے اچھوتے کام کے ظاہری اسباب میسر نہ تھے۔ اور کیسے میسر ہو سکتے تھے، جب کہ جوانی گزر چکی تھی، اور مسلسل مشغولیت کے باعث نئی تصنیف کے اسباب منقطع تھے، مزید برآں اپنے اکابرین کی فقہی کتب کی تحریر، مختلف آفاق سے آئے فتاوی کی گتھیاں سلجھانے کا کام الگ، اور ان کی تحریر وتقریر کی ذمہ داری مستزاد، ... ان سب مشغولیتوں کے باوجود میں نے اس شرح کے لیے روزانہ ایک گھنٹہ فارغ کر کے کام شروع کرنے پر کمر ہمت باندھی، .....اس میں میرے پیش نظر اجنبی، نامانوس اور متروک وغیر معمول بہا مسائل کا ایسے اسلوب سے بیان کرنا رہا جس سے نگاہوں کو ٹھنڈک ملے، اور طبیعت ادھر کو کھنچے۔ خاص طور پر عقائد کے باب کی طرف خصوصی توجہ دی ... ۔

مزید یہ کہ متن اور اسناد کی تصحیح کا خاص اہتمام کیا، اس لیے کہ اوروں میں سے کسی نے اس طرح توجہ نہیں دی، حالانکہ تمام احوال

ومسالک میں یہ نکتہ خصوصی توجہ کا زیادہ حق دار تھا، اس لیے کہ حدیث سے استدلال کرنا حدیث کی صحت وحسن پر موقوف ہے، الّا یہ کہ فضائل کا باب ہو تو اس میں ضعیف حدیث پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کا ضعف بہت شدید نہ ہو۔ اور ان اصولی باتوں پر ان تمام علماء کا اتفاق ہے جن کی آراء کا علم وفن کی دنیا میں کوئی وزن ہے۔

اور میں نے اس کتاب کا نام "فَتْحُ الإِلٰهِ فِي شَرْحِ المِشْكَاة" رکھا ہے۔ میں اللہ کی مخلوق میں بہترین ہستی کے واسطے سے، اللہ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس کی تکمیل کی توفیق دے، اس کے ذریعے سے نفع عام کرے اور مجھے اپنی رضا اور فضل عطا فرمائے۔ ہر خیر کا کفیل وہی ہے۔ وہی مجھے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ مجھے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اسی پر توکل کرتا ہو، وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ مجھے ملی ہوئی یہ توفیق اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے۔ میں اسی پر توکل کرتا ہوں، اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا، رحم کرنے والا، عطا کرنے والا، سخاوت کرنے والا، برداشت کرنے والا اور کرم کا معاملہ کرنے والا ہے۔ نیکی کرنے کی قوت اور برائی سے بچنے کی ہمت اسی اللہ کی توفیق سے ہے جو بلند وبرتر اور عظمت والا ہے"۔

انتہائی افسوس اس بات کا ہے کہ موصوف صرف نصف حصے کی شرح کر پائے اور ان کی وفات ہوگئی، اور اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ نا تمام رہ جانے کی وجہ سے، نہ تو یہ مشہور ہوئی، اور نہ ہی اسے قبولِ عام حاصل ہوا۔ میں نے اس شرح کا ایک خطی نسخہ جو "کتاب الجنائز" تک کا ہے، مَكْتَبَةُ الكُلِّيَةِ الشَّرقِيَّة، پشاور میں دیکھا ہے۔

ان تمام شروحات کے بعد "مشکاۃ المصابیح" کی شرح ملا علی قاری نے کی اور اس کا نام "مِرْقَاةُ المَفَاتِيح" رکھا۔

اب ہم ان خصائص کی طرف اشارہ کریں گے جن کا التزام ملا علی قاری نے اپنی اس شرح میں کیا ہے، اور ان اسباب پر نظر ڈالیں گے جنھوں نے ملا علی قاری کو اس کتاب کی شرح کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ ہم کہتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شرح حدیث، بیانِ معانی اور ضبطِ اثر ومبانی وغیرہ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور ان کے بعد کے محدثین ان کے محتاج ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ، موطأ، مشکاۃ اور ریاض الصالحین کی شروح اور ان کے حواشی ملا علی قاری کی ان نقول سے بھرے ہوئے ہیں، جو ملا علی قاری کی "مِرْقَاةُ المَفَاتِيح"، "مُوَطَّأ الإِمَام مُحَمَّد" اور "مُسْنَدُ أَبِي حَنِيفَة" کی شروح اور ان کی دوسری تصنیفات سے لی گئی ہیں۔ ان کی بڑی خوبی اور علمی خدمت کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ: انہوں نے مذہب حنفی کو کتاب وسنت پر پیش کیا، اور پھر جیسا کہ انہوں نے "شَرْحُ النُّقَايَة" کے مقدمہ میں بتایا ہے کہ: ان کے سامنے یہ بات اظہر من الشمس ہو گئی کہ بہ نسبت اوروں کے، حنفیہ رحمہم اللہ، سب سے زیادہ سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ ہمارے حنفی علماء بہ نسبت دوسروں کے سب سے زیادہ سنت کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور یہ کہنا اس وجہ سے صحیح ہے کہ: انہوں نے مراسیل کو مسند کی طرح قابل اعتماد قرار دے کر قبول کیا ہے۔ اور یہ بات تو اجماعی طور پر تسلیم شدہ ہے کہ مراسیلِ صحابہ بغیر کسی نزاع کے مقبول ہیں۔ امام طبری نے کہا ہے: علماء امت کا مرسل احادیث کے مقبول ہونے پر اجماع ہے۔ اور دوسری صدی کے آخر تک ان میں سے کسی ایک سے بھی اس مسلمہ کا انکار مروی نہیں ہے۔ بعض رواۃ کا کہنا ہے کہ ان کے اس قول سے مراد امام شافعی رحمہ

اللہ ہیں، اور حافظ ابو عمر ابن عبد البر نے بھی "التمھید" میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا جس کسی نے ہمارے اصحابِ حنفیہ کو، سنت کی مخالفت اور رائے اور قیاس کے اعتبار کی طرف منسوب کیا ہے، وہ بہت بنیادی غلطی کا شکار ہے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک صحابہ پر موقوف روایت بھی قیاس پر مقدم ہے، اور یہی حال ضعیف حدیث کا ہے (کہ وہ بھی رائے اور قیاس سے مقدم ہوا کرتی ہے)۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ: جس شخص نے بھی مذکورہ مسائل میں ہمیں خطا کار کہا ہے، دراصل وہ اس کی اپنی غلط رائے اور فاسد قیاس ہے۔

حاصل بحث یہ ہے کہ: حدیث مرسل جمہور کے ہاں حجت ہے۔ اور ان میں سے امام مالک بھی ہیں۔ حافظ ابو الفرج ابن جوزی نے "اَلتَّحقِيق عَن أحمَد" میں نقل کیا ہے، اور خطیب نے اپنی کتاب "الجامع" میں روایت کیا ہے کہ: امام مالک کا فرمان ہے: "بسا اوقات مرسل حدیث مسند سے بھی قوی تر ہوتی ہے"۔

ہمارے اصحاب میں سے عیسیٰ بن اَبان اور اصحاب مالک کی ایک جماعت نے اس بات پر قطعیت کا اظہار کیا ہے کہ مرسلات، مسندات سے بھی اولیٰ ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے سند کے ساتھ حدیث بیان کر دی، اس نے جن راویوں کے نام ذکر کیے ہیں، ان کی چھان بین اور بحث کی ذمہ داری تمہارے سپرد کر دی۔ اور جس نے علمی دیانت، دین داری اور ثقاہت کی وجہ سے ائمہ سے کوئی حدیث مرسلاً روایت کی، تو گویا اس نے اس حدیث کی یقینی صحت کا اظہار کر دیا۔ اور تمہارا، اُسے مرسلاً دیکھ لینا ہی تمہیں کفایت کرتا ہے۔

ہمارے اور امام مالک کے اصحاب کی ایک دوسری جماعت کا کہنا یہ ہے کہ: ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مرسل حدیث، مسند سے زیادہ قوی ہے، لیکن مرسل اور مسند احادیث وجوبِ حجت میں برابر ہیں۔ ان حضرات کا استدلال اس بات، سے ہے کہ سلف نے احادیث کو مرسلاً بھی بیان کیا ہے، موصولاً بھی بیان کیا ہے، مسنداً بھی بیان کیا ہے۔ یعنی ان حضرات کے مختلف اسلوب رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود بھی کسی نے کسی پر کوئی الزام نہیں دھرا کہ اس نے فلاں نہج کیوں اختیار کی ہے۔

ہاں، امام شافعی رحمہ اللہ نے مرسل روایت کو رد کیا ہے، اِلّا یہ کہ وہ مرسل روایت کسی دوسری سند سے مسنداً مل جائے، یا وہ ایسی مرسل روایت ہو جسے پہلی سند کے رجال کے سوا کسی دوسرے نے بھی مرسلاً روایت کیا ہو، یا وہ مرسل کسی صحابی کے قول سے تائید یافتہ ہو، یا اکثر اہل علم کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہو، یا اِرسال کرنے والا ہمیشہ عادل راوی ہی سے مرسلاً روایت کرتا ہو۔ اس مسئلے کو امام فخر الدین اور آمدی نے یونہی بیان کیا ہے۔

ابن حاجب نے کہا ہے کہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے اس اصول پر گرفت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: اگر یہی شرط ہو کہ مرسل تب ہی مقبول ہو گی جب کہ کوئی مسند آ جائے، تو پھر تو عمل اس مسند پر ہوا، جو کہ وارد شدہ ہے، نہ کہ اس مرسل روایت پر۔ اور اگر کوئی دوسری مسند روایت نہ ملے، بلکہ اس جیسی دوسری مرسل ہی ملے، تو مآل یہی تو ہے کہ ایک غیر مقبول روایت کے ساتھ دوسری غیر مقبول روایت شامل ہو گئی ہے۔ ابنِ حاجب کا کہنا ہے کہ: دوسری شق پر اعتراض وارد کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ بسا اوقات ظن کی شمولیت سے قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ واللّٰهُ سُبحَانَهُ وتَعَالىٰ أعلَمُ بِحَقَائِقِ المَرَام.

پھر یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ: متاخر محدثین نے حدیث کی تقسیم میں صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع اور معضل وغیرہ کی وہ اصطلاحات قائم کی ہیں جو اصولِ حدیث کی معروف انواع ہیں، اور ہم نے اس کی مکمل تحقیق حافظ ابن حجر عسقلانی کی "شَرْحُ النُّخْبَة" پر لکھی ہوئی اپنی شرح میں کردی ہے۔ اور مذکورہ بالا تقسیم کے بعد متاخرین نے مرسل اور اس کے بعد ذکر کی جانے والی اقسام کو مردود قرار دے دیا، جب کہ سلفِ متقدمین نے ان اقسام میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا ہے، چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی موطأ میں یہی نہج اپنایا ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ: متقدمین سلف کے نزدیک مرسل، صحیح اور حسن احادیث کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، اور ان کے ہاں "منقطع" اور "معضل" پر بھی مرسل کا اطلاق کردیا جاتا ہے۔

ہمارے مخالفین نے جب یہ دیکھا کہ ہم احادیث مرسلہ سے احتجاج کرتے ہیں تو اپنی قائم کردہ اصطلاح کی بنیاد پر یہ کہنے لگے کہ: یہ احادیث تو ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہمیں ایسی ضعیف احادیث پر عمل کی طرف منسوب کرنے لگے جو ان کے زعم میں حدیث صحیح اور حسن کے معارض ہیں۔ پھر ہمارے متقدمین اصحاب جیسے امام طحاوی، ابوبکر رازی اور امام قدوری وغیرہ، اپنی کتب میں اس بات کا اہتمام کرتے رہے کہ سنت کے ثابت شدہ دلائل اور ان کی تحقیق کے ساتھ ساتھ، حدیث کے صحیح، حسن اور ضعیف ہونے کی وضاحت بھی کرتے رہیں۔ جب کہ ہمارے متاخرین نے اس باب میں اتنی زیادہ تفصیل سے کام اس لیے نہیں لیا کہ ان کو متقدمین کے ہاں طے شدہ دلائل، ان کی تحقیق اور وضاحت پر پورا اعتماد تھا۔ چنانچہ (اس جوہری فرق کی حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے) انہوں نے سنت وشریعت کو چھوڑ دینے کا الزام ہمارے سر تھوپ دیا۔ حالانکہ کسی کے لیے بھی یہ جائز نہ تھا کہ وہ ہمارے اصحاب کو اس شنیع خصلت کی جانب منسوب کرتا۔ جب کہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مخالف شافعی علماء ایک ایسے نکتے کی بنیاد پر ہماری عیب جوئی کررہے ہیں جس میں خود شافعی علماء ملوث ہیں۔

چنانچہ امام ابواسحاق نے "المُهَذَّب" میں، اور امام الحرمین نے "النِّهَايَة" میں، اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بکثرت احادیثِ ضعیفہ سے استدلال کیا ہے۔ متقدمین شافعیہ میں سے امام بیہقی نے، اور متاخرین شافعیہ میں سے امام نووی اور منذری نے کئی جگہوں پر یہ بات بتائی ہے۔ بلکہ امام الحرمین جوینی نے تو ایک جگہ ضعیف حدیث کو صحیح کہہ دیا ہے، جس پر شیخ تقی الدین، ابن صلاح، امام نووی اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے ان کی تغلیط کی ہے۔

اب ہمارے ذمہ یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم احادیث ذکر کرکے، ان کی تحقیق وتبیین کریں، اور ان احادیث کی تخریج کرنے والوں کا پتہ بتاکر ان کی تعیین کریں۔ صاحب ہدایہ جب کسی مسئلہ کے درایتی پہلو کو روایتی پہلو سے تقویت دینے کے لیے مجمل احادیث کو بایں طور ذکر کرتے ہیں کہ ان احادیث کی تخریج کرنے والوں کی اسناد نقل نہیں کرتے، تو ان کا یہ اسلوب ان کی ذکر کردہ بعض احادیث کے لیے سبب طعن بن جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِيْن۔

(دیکھیے: "شرح النقاية مع حاشية محمود الرواية" (ص ۱، و ۲، هند ۱۳۵۱هج)۔)

علم حدیث جیسے عظیم الشان علم کی خدمت میں ان کی، کی ہوئی قابلِ قدر کوششوں کے بارے میں بتاتے ہوئے ہم خوشی اور سعادت

محسوس کر رہے ہیں۔ احادیث کے متون کو ضبط کرنے میں عموماً، اور خصوصاً مشکاۃ شریف کی احادیث کو ضبط کرنے میں، متاخرین پر ان کا بڑا احسان ہے۔ ضبط سے یہاں ہماری مراد محدثین متقدمین اور متوسطین کا ضبط نہیں ہے۔ بلکہ علماء متاخرین کے ہاں متعارف ضبط ہے۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"کسی بھی حدیث کی صحت کے لیے پائے جانے والے ضبط کے تین احوال امت میں پائے جاتے ہیں:

اول: یہ کہ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں وہ احادیث کو زبانی یاد کر کے اسی پر اکتفا کرتے تھے، اور ان دنوں ان کی قوتِ حافظہ انتہائی اچھی تھی۔

دوم: یہ کہ تبع تابعین کے زمانہ میں، اور ساتویں اور آٹھویں طبقہ کے ابتدائی محدثین کے زمانے تک وہ احادیث کو لکھا کرتے تھے۔ ان دنوں ضبطِ حدیث میں خط وکتابت کی وضاحت، نقاط، حرکات وسکنات اور حروف لکھنے کے انداز میں احتیاط، اور کتابت شدہ مواد کے صحیح اصول کے ساتھ مقابلہ کرنا اور پھر اس لکھے ہوئے کو یاد کرنا جیسے امور داخل تھے۔

سوم: یہ کہ حفاظ محدثین نے اسماءِ رجال، غریبِ حدیث، اور مشکل الفاظ کے ضبط پر بڑی بڑی کتب تصنیف کیں۔ کتب احادیث کی تفصیلی شروح لکھیں اور علم حدیث میں جو جو باتیں قابلِ بحث تھیں، اور جن جن نکات کی تحقیق ضروری تھی، ان سب سے تعرض کیا۔

لیکن جہاں تک آج کل کے ضبط کا معاملہ ہے، تو اس میں ضبط کا دائرہ یہی ہے کہ علم حدیث کی رغبت رکھنے والا طالب علم ان اَعلام محدثین کی تصانیف اور شروحات کو بنظرِ اِمعان دیکھے۔ اور صحت واتقان کے ساتھ احادیث کو ان کی اصلی حالت پر باقی رکھتے ہوئے روایت کر دے۔ یہیں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں اہلِ علم محدثین نے تساہل برتا، اور اس زمانے میں ان امور میں تسامح سے کام لیا جس میں متقدمین نے شدت سے کام لیا تھا۔ جیسا کہ محدثین متوسطین نے حفظ میں تساہل سے کام لیا اور صرف لکھنے پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے متوسطین کے ہاں "وِجادة" اور مجرد "مُنَابَذَة" اور اس جیسی دوسری چیزیں رواج پا گئی تھیں، بخلاف پہلے طبقات کے، کہ ان کے ہاں ایسی باتیں مروّج نہ تھیں"۔ (دیکھیے: "الحِطّة ص ٦٢")

ملا علی قاری رحمہ اللہ ضبط کی تیسری قسم میں انتہائی کامل اور ماہر تھے، چنانچہ انہوں نے جب مشکاۃ شریف کو لکھا تو صحیح اور معتبر نسخوں کو انتہائی محنت سے جمع کیا اور بہت عرق ریزی سے اس کی تصحیح کی۔ اپنی کتاب "مِرْقَاةُ المَفَاتِيح" کے مقدمے میں اپنی ان کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے خود ہی رقم طراز ہیں:

"یہ سب اکابر علماء، جن کے سامنے میں نے مشکاۃ شریف کی قراءت کی، حدیث شریف کے حفاظ میں سے نہیں تھے، اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی ایسا صحیح نسخہ تھا جس پر بندۂ ضعیف اعتماد کر سکتا۔ اور شراح مشکاۃ شریف نے ضبط کلمات کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ ان کا مطمحِ نظر تو بس احادیث کی وضاحت تھی۔ چنانچہ ان کے ذکر کردہ متن پر نہ تو میرا دل مطمئن ہوا، اور نہ ہی مجھے اس سے کم پر شرح صدر ہوا کہ میں علماء کے سامنے پڑھے اور سنے گئے تصریح شدہ اور تصحیح شدہ ایسے نسخے جمع کروں جو اعتماد کیے جانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، اور استناد میں اختلاف کے وقت صحیح قرار دیے جا سکتے ہوں۔ چنانچہ جو نسخے میں نے جمع کیے ان میں سے بعض یہ ہیں:

پہلا نسخہ : جو سید اصیل الدین، سید جمال الدین اور ان کے پوتے میرک شاہ کا ہے، اور یہ سب مشہور محدثین گزرے ہیں۔

دوسرا نسخہ : وہ ہے جو شیخ الاسلام ہروی (۹۹) کے سامنے پڑھا گیا۔

---

۹۹ : موصوف نے جو یہ کہا ہے کہ: ''وہ نسخہ جو شیخ الاسلام ہروی کے سامنے پڑھا گیا''۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مراد علامہ شیخ احمد ابن یحییٰ بن محمد سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی ہروی ہیں، جو شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور ہیں۔ میرزا محمد باقر موسوی خوانساری اصبہانی (ت ۱۳۱۳ھ) اپنی کتاب "روضات الجنات في أحوال العلماء والسّادات" میں کہتے ہیں:

''احمد بن یحییٰ بن سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی ہروی، جو شیخ الاسلام کے لقب، اور ''احمد الحفید'' کے نام سے بایں وجہ مشہور ہیں کہ آپ محقق تفتازانی کے احفاد میں سے تھے۔ جیسا کہ معروف ہی ہے''۔

آپ اکثر علوم میں نادرِ روزگار اور یکتائے زمانہ تھے، خصوصاً فقہ و حدیث اور تفسیر میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عام قضاۃ اور مشائخ میں بہت بڑے درجے کے حامل تھے۔ آپ سلطان حسین مرزا "بایقرا" کے دورِ حکومت میں ۳۰ھ سے، ہرات کے عہدۂ قضا پر اس وقت تک فائز رہے جب کہ پہلے صفوی بادشاہ سلطان اسماعیل بن سلطان حیدر صفوی موسوی کے لشکر نے وہاں کا رخ کیا، ... اور انہوں نے .... ۹۱۶ھ کے کچھ مہینوں میں اس شہر کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا سلطان کا ہرات کے علماء کی ایک جماعت جس میں آپ بھی شامل تھے، کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ: انہیں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ مذکورہ بالا شیخ کو رمضان المبارک مذکورہ بالا فتح کے سال ہی رمضان المبارک میں مذکورہ بالا سلطان کے جلادوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

اس شہید شخصیت کی تصنیفات میں سے ایک متفرق فوائد کا مجموعہ ہے، جو حلِ مشکلات سے متعلق فوائد، مغلقات کی توضیح، آیات و احادیث کے درمیان موہومہ منافات کے دور کرنے اور ملح و حکایات کے نوادرات، اکثر لوگوں سے مخفی امور پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں تقریباً تین سو فوائد کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ ایک فصل کے تحت ذکر کیا ہے، جیسے دسترخوان کے کناروں پر مختلف رنگوں کے کھانے چنے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ درج ذیل کتب بھی آپ کے قلم سے ہیں: "حاشية على مختصر شرحي التلخيص"، آپ کی جانب ہی منسوب ہے۔ اپنے دادا کی "تهذيب المنطق" کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ اس کا سن تالیف ۸۸۲ھ ہے۔ اس کے علاوہ علم کلام میں "العقائِدُ النَّسَفِيَّة" کی تفتازانی کی شرح پر بڑی لطیف تعلیقات بھی لکھی تھیں۔

ملا علی قاری نے شیخ الاسلام ہروی اور ان کے شیخ کے والد مقری شیخ معین الدین کی شہادت کا قصہ اپنے رسالہ "شمُّ العوَارض في ذمّ الرّوافض" میں یوں ذکر کیا ہے:

''خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں خواہ مخواہ شدت اور سلب کے ساتھ تعصب ممنوع ہے جس کے چھوڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر کئی ایسے امور مترتب ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں ضرر، اور ممنوعہ اعمال کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا ہے:

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں صرف حق سچ بات کہو۔

اور مزید ارشاد فرمایا:

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو۔....... ......

...... ہمارے بزرگ اور مغفور شیخ محمد بن ابوالحسن بکری نے مکہ مکرمہ میں، مقامِ حنفی پر جو معروف طور پر منع کیا تھا، اس میں انہی آیات سے استدلال کیا تھا۔ اور بڑی واضح آواز میں کہا تھا: اوباش رافضی پر اللہ کی لعنت ہو، اور قزلباش کے گروہ پر اللہ کی مار پڑے۔ اس کے بعد کہا: یہ خبیث لوگ جو اہل سنت والجماعت کے گروہ کو گالیاں نکالتے ہیں، یہ برا بھلا کہنا اسی کے سبب سے ہے۔ اور اہلِ عناد کا طرزِ عمل یہی رہا ہے۔

اور شیخ محمد بن ابوالحسن صدیقی نے اپنے مقام حقیقی میں بالکل سچ کہا ہے، اور ان کا کلام قراءت میں میرے مرحوم استاذ مولانا معین الدین بن حافظ زین الدین، جو زیارت گاہ کے رہنے والے تھے، کے کلام کے بالکل موافق ہے۔ اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رافضہ کے غلبے کے زمانے میں فی سبیل اللہ شہادت کا رتبہ پایا۔

اس کا قصہ یہ ہوا کہ: جب رافضیوں کے بادشاہ شاہ اسماعیل کا ظہور ہوا، تو اس نے بہت قتل وقتال کے بعد ملک عراق کو فتح کر لیا، اور ہر طرف قتال اور اس میں قتل ہونے والوں کی لاشیں پھیلا دیں، تو اس کے بعد خراسان کے رہنے والوں کی طرف ایک خط لکھا، جس میں اپنے اس قبیح طریقے سے غلبے کا اظہار تھا۔ اور آخر میں اس نے بعض اکابر صحابہ کو سب وشتم بھی کیا تھا۔ حافظ صاحب مذکور ہرات کے شہر میں جامع مسجد کے مشہور خطیب تھے۔ ان ملعون روافض نے علماء ومشائخ اور امراء کے بھرے مجمع میں آپ کو منبر پر چڑھ کر وہ خط پڑھنے کا حکم دیا۔ ان حاضرین میں علامہ ولی شیخ الاسلام ہروی بھی تھے، جو کہ محقق ربانی مولانا سعد الدین تفتازانی کے پوتے تھے۔

جب خطیب پڑھتے پڑھتے سب وشتم کے مقام پر پہنچا تو اس عبارت کو چھوڑ کر ان کا ادب سے تذکرہ کیا، تو ان رافضی کتوں نے بایں سبب آپ کے ساتھ اور بھی تعصب برتا، اور بولے: بڑا مقصود اور مطلوب حصہ تو تم نے چھوڑ ہی دیا ہے۔ اس کلام کو دوبارہ دہراؤ، تاکہ یہ پوری طرح ظاہر ہو جائے۔ اس صورتِ حال میں خطیب صاحب خاموش ہو گئے، تو شیخ الاسلام نے انہیں اشارے سے کہا کہ: جو بھی لکھا ہوا ہے، وہ پڑھ دو۔ کیونکہ اِکراہ اور مجبور کیے جانے پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ مگر وہ سب وشتم کرنے پر راضی نہ ہوئے، اور قابلِ مذمت رخصت کی بجائے عزیمت اختیار کرنے کا عزمِ مصمم کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کو منبر سے نیچے اتارا، انہیں قتل کیا اور ان کی میت کو جلا ڈالا۔

بعد میں جب ملعون رافضی سلطان، خراسان آیا تو اس نے سب اکابر زمانہ اور شیخ الاسلام کو بلوایا، اور شیخ کو حکم دیا کہ وہ اسی جگہ صحابہ کو سب وشتم کریں۔ مگر۔ اللہ ان سے راضی ہو۔ وہ بھی اس پر تیار نہ ہوئے۔ اس پر ان معلونوں نے کہا کہ: اب سے پہلے، آپ ہی نے تو خطیب کو پڑھ دینے کا حکم دیا تھا، اب اپنے حکم کی مخالفت کیسے کر رہے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ تو فتویٰ تھا، اور یہ، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، تقویٰ ہے ..... اس پر ملعون سلطان نے آپ کو قتل کر کے شہید کر دیا، مگر آپ اس شہادت سے یقیناً خوش بخت ہو گئے۔

شیخ ابوالحسنات محمد عبدالحی لکھنوی (ت ۱۳۰۴ھ) نے اپنی کتاب "السعایۃ" کے مقدمے میں کہا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

"الوقایۃ" کے شراح اور حاشیہ نگاروں میں شیخ الاسلام احمد بن یحییٰ بن محمد بن سعد الدین عمر بن مسعود تفتازانی بھی ہیں جو حفید تفتازانی کے نام سے مشہور تھے۔ میں نے ان کا حاشیہ از اوّل تا آخر مطالعہ کیا ہے۔ موصوف "مختصر الوقایۃ" کے شارح الیاس زادہ کے تلامذہ میں سے تھے، جیسا کہ انہوں نے خود ہی وضوء کی بحث کے ذیل میں بتایا ہے۔ اس حاشیہ کے آخر میں انہوں نے کہا ہے کہ: وہ اس حاشیہ کی تالیف سے ربیع الاول ۹۰۰ھ میں فارغ ہو رہے ہیں۔

آپ کی تصنیفات میں سے "شرح تہذیب المنطق"، "حواشی التلویح" اور "شرح السراجیۃ" ہے۔

اوران کے علاوہ ایسے مزید صحیح اور معتمد علیہ نسخے جمع کیے جن پر صریح صحت کی علامات تھیں۔ لہٰذا میں نے تمام نسخوں کے مجموعے سے ایک بنیادی متن تیار کیا، اوراس طرح میں نے اپنے لیے اخروی ثواب حاصل کرنے کا سبب تلاش کیا ہے''۔

ملاعلی قاری کی اس کتاب کی طرف خصوصی توجہ، معرفت، ضبط اور اتقان کی وجہ سے، بعد میں "مشکاۃ" کا یہی نسخہ تمام نسخوں کی بنیاد قرار پایااوراس نے مشکاۃ کی تصحیح کے لیے کسی نئی کوشش کرنے سے علماء کو مستغنی کردیا۔ اور یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جو نہ توان کے شیخ، شارحِ "مشکاۃ" حافظ ابن حجر ہیتمی مکی کے ہاں پائی جاتی ہے، اور نہ ہی ان کے دوسرے شیخ عبداللہ سندی کے ہاں موجود ہے، باوجودیکہ ثانی الذکر نے مشکاۃ شریف کی تصحیح میں عمر کھپادی تھی۔

ملاعلی قاری کی شرح کی دوسری خصوصیت ان کا شرح حدیث سے خصوصی اعتنا ہے۔ انہوں نے انتہائی محنت سے کتاب کی تصحیح کرنے کے بعد بقدرِ فہم ایسی شرح کی ہے جو مکمل معانی کو بیان کرتی ہے، اور حدیث کے متون کے ضبط کو بتانے کے ساتھ ساتھ اس میں موجود غریب الحدیث، اعراب، معانی، فقہ، تفسیر، اشارات، کلام اوراس سے استنباط شدہ احکام کی اس طرح تفصیل بتاتی ہے کہ فقہی آراء میں سے قابلِ ترجیح رائے کی وجوہات سے بھی بحث کرتی ہے۔

...... "حبیب السِّیَر" میں ہے:

''آپ دنیا بھر کے بڑے علماء میں سے ایک، علماء بنی آدم کی پناہ گاہ اوراپنے زمانے میں علمِ حدیث وفقہ اور باقی نقلی وعقلی علوم وفنون میں فائق تھے۔ جب ۲۴ ذوالحجہ، ۸۸۷ھ کو، بروز سوموار، آپ کے والد صاحب قطب یحییٰ کی وفات ہوئی، جو کہ مرزا شاہ رخ بن تیمور کے عہد سے لے کر مرزا سلطان حسین کے عہد تک "مشیخة الإسلام" کے منصب پر فائز رہے تھے، توان کے مناصب کی ذمہ داری آپ کے سپرد کردی گئی۔ آپ خطۂ خراسان میں تقریباً تیس سال تک تدریس بھی کرتے رہے۔ حتی کہ ۹۱۶ھ میں جب ان کی معزولی کا حکم سلطان حسین کی جانب سے آ گیا، تو آپ نے ان مناصب کو چھوڑا۔ آپ کی وفات بھی اسی سال ہوگئی۔

میں نے ان کے والد صاحب، دادا جان اور پڑدادا جان سعد الدین تفتازانی کے تفصیلی حالات کو "الفوائد البهية و تعليقاته السنية" (ص ۱۶) میں ذکر کیا ہے''۔

میں کہتا ہوں: مصر سے ۱۳۲۲ھ میں مصر سے علامہ حفید کی کتاب "الدُّرُّ النَّضيد من مجموعة الحفيد" چھپی تھی، جو کہ چودہ علوم کے اہم مسائل پر مشتمل تھی۔

عبدالحئی لکھنوی ہی نے "التعليقات السنية" میں کہا ہے:

''میں کہتا ہوں: آپ حفیدِ تفتازانی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی کئی تصنیفات متداول ہیں، جن میں سے ایک اپنے دادا کی "التلويح حاشية التوضيح" پر حواشی ہیں۔ مزید آپ نے صدر الشریعہ کی "شرح الوقاية" پر بھی حواشی لکھے تھے جو کہ حواشی شیخ الاسلام کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے آخر میں کہتے ہیں کہ: ''ان حواشی کے لکھنے سے فراغت ۹۰۰ھ میں ہوئی ہے''۔ میں نے ان حواشی کا مطالعہ کیا ہے۔ آپ کی تصنیفات میں "تهذيب المنطق" کی شرح، اوراپنے جدِّ امجد پر کلام بھی ہے۔ علاوہ ازیں "شرح الفرائض السراجية" وغیرہ بھی آپ کی تالیفات میں سے ہے۔

ملا علی قاری نے اپنی اس شرح میں سابقہ لکھی گئی تمام شروح کے تمام فوائد کو بایں طور جمع کر دیا ہے کہ اگر کہیں استدراک کی ضرورت تھی تو بقدر استطاعت اس طرح استدراک کیا کہ احادیث میں موجود موضع اشکال کو اس کے مالہ وما علیہ کے ساتھ بیان کرنے کے بعد، متقدم مفسرین کے اجمال کی مکمل تشریح کی۔ اور اس کوشش میں ان کا اسلوب بہت ہی بہترین ہے، چنانچہ انہوں نے دونوں اسالیب، یعنی روایت اور درایت کو بطریق احسن ایسے ہی جمع کر دیا ہے جیسا کہ علامہ تورپشتی (۱۰۰) اور علامہ طیبی (۱۰۱) نے کیا ہے۔ موصوف نے معانی کی توضیح اور مقصود کی وضاحت میں شرح کو متن کے ساتھ ممزوج ذکر کیا ہے، اور اطناب مُمل اور اختصار مخل سے اجتناب کیا ہے۔ موصوف اپنی اس نہج کے بارے میں خود ہی "مُقَدِّمَةُ الکِتَاب" میں کہتے ہیں:

۱۰۰: آپ شہاب الدین ابو عبداللہ فضل اللہ بن تاج الدین ابو سعید حسن بن حسین بن یوسف حنفی ہیں۔ آپ کی ولادت تورپشت میں ہوئی۔ وہیں پلے بڑھے اور شیراز کے کبار علماء سے علوم کی تحصیل کی۔ علم وفضل وکمال کی کئی ایسی اقسام کو جمع کیا کہ آپ کے زمانے میں کسی نے اتنی اقسام کو جمع نہیں کیا تھا۔ آپ نے اپنی عمر کو علوم کی نشر واشاعت، تدریس اور تصنیف وارشاد میں گزارا۔

آپ امام، ذہین، ثاقب الذہن، ماہر فقیہ، ماہر محدث، اسماءِ رجال کی بصیرت رکھنے والے، علم کلام اور سنن، تفسیر، بلاغت اور ادب جیسے علوم میں متبحر تھے۔ آپ نے فقہ الحدیث کی طرف اس کے شایانِ شان توجہ دی، حتیٰ کہ انتہا کو جا چھویا۔ پھر علوم کی نشر واشاعت میں مشغول ہوئے تو ان پر فوقیت لے گئے۔ آپ نے تصنیف وتالیف کے ساتھ تدریس بھی کی، اور آپ کا نفع عام ہوا۔

سبکی نے آپ کو "الطبقات الشافعية الكبرىٰ" کے چھٹے طبقہ کے ان لوگوں میں ذکر کیا ہے جو چھے سو اور سات سو کے درمیان فوت ہوئے۔ موصوف نے ان کے شافعی المسلک ہونے پر فخر کرتے ہوئے کہا ہے:

''توربشت: اوپر کے دو نقطوں والی تاء کے ضمہ، اس کے بعد ساکن واو، پھر راء مکسورہ، پھر ایک نکتے والی باء مکسورہ، پھر نقطوں والی شین اور آخر میں اوپر کے دو نقطوں والی تاء کے ساتھ ہے''۔

آپ شیراز کے رہنے والے محدث فقیہ تھے۔ آپ نے بغوی کی "المصابیح" کی بہت اچھی شرح کی تھی۔ بخاری شریف کو عبد الوہاب ابن صالح بن محمد بن معتزام سے روایت کیا، جو کہ جامع عتیق کے امام تھے۔ اور وہ حافظ ابو جعفر محمد بن علی سے روایت کرتے ہیں، اور انہوں نے کہا کہ: ہمیں ابو الخیر محمد بن موسیٰ صفار نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: ہمیں ابو الہیثم کشمهینی نے خبر دی، وہ کہتے ہیں: ہمیں فربری نے خبر دی۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ بالا شیخ کی وفات ۶۰۲ھ کے لگ بھگ ہوئی، اور فتنۂ تاتار نے آپ کے حالات کی معرفت پر دبیز پردے ڈال دیئے''۔

اس کے بعد سبکی نے آپ کی کتاب "المیسَّر" سے فوائد کے چند منتخب ٹکڑے اپنی کتاب "الطبقاتُ الکبریٰ" میں نقل کیے ہیں۔

مشہور مؤرخ ابو الخیر احمد بن مصطفیٰ معروف بہ طاش کبریٰ زادہ (ت ۹۶۲ھ) نے اپنی کتاب "مفتاحُ السَّعادَة ومِصباحُ السِّيادَة" میں آپ کے حنفی ہونے کی تصریح کی ہے۔ علاوہ ازیں، ملا علی قاری بھی آپ کو کبار ائمہ حنفیہ میں شمار کرتے ہوئے اپنی کتاب: "مرقاة المفاتيح" (۵۳۸:٤، طبع مصر) میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے ائمہ میں سے علامہ تورپشتی نے کہا ہے: ....''۔

حافظ عصر نخبۂ دہر علامہ سید انور شاہ کشمیری نے بخاری شریف پر "فیض الباري" نامی اپنے امالی میں (۲:۳۰ طبع القاہرہ) کہا ہے:......

..... ''ابن دقیق العید رحمہ اللہ (میرا خیال ہے کہ: اس مقام پر آپ کے تلمیذ شیخ محمد بدر عالم میرٹھی جنہوں نے آپ کے امالی ضبط کیے ہیں، سے بھول ہوگئی ہے، اور صحیح تاج الدین سبکی ہے) نے کہا ہے: اگر اس فاضل محدث کی کتب امت کو مل جاتیں، تو بہت نافع ثابت ہوتیں، لیکن فتنۂ تاتار نے ان کو ضائع کر دیا۔ اور لوگوں کا خیال ہے کہ آپ شافعی المذہب تھے۔

میں (یعنی شاہ انور کشمیری) کہتا ہوں: بلکہ یہ خلافِ واقعہ ہے، کیونکہ وہ حنفی تھے...، اور جس نے طبقات شافعیہ میں ان کا تذکرہ موجود ہونے اور محدث ہونے کو دیکھ کر شافعی المسلک ہونا سمجھا ہے، وہ وہم کا شکار ہوا ہے''۔

مزید فرماتے ہیں:

''اور علامہ طیبی کے قلم سے بھی ایک شرح ہے، اور اس کے مصنف اگرچہ حافظ نہیں تھے، لیکن عربی نکات کے اعتبار سے تمام شروح سے بہتر ہے۔ اور جہاں تک فضل اللہ تورپشتی کا تعلق ہے تو وہ کبار حفاظ میں سے اور حنفی المسلک تھے، شافعی المسلک نہ تھے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ (دیکھیے: "فیض الباري" (٢ : ١٦١).

اور اپنی کتاب "العَرفُ الشّذي علی جامع التّرمذي" (طبع هند ص ٤٦٠) میں رقم طراز ہیں کہ: تورپشتی نے کہا ہے کہ مرجئہ فرقہ کے لوگ جبریہ ہیں۔ اور وہ حافظ ہیں۔ اور فضل اللہ تورپشتی کلام میں حاذق ہیں۔

ان کے بارے میں فقیر محمد جہلمی نے اپنی اردو کتاب "حدائق الحنفیة" (ص ٢٥٨، طبع لکهنئو ١٩٠٦ م) میں کہا ہے:

شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی اپنے زمانے کے امام، محقق، باریک بیں، محدث، قابلِ بھروسہ اور ماہر فقیہ تھے۔ آپ کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں۔ انہی میں سے ایک بغوی کی "مصابیح السُّنَّة" کی شرح ہے جس کا نام انہوں نے "المُیَسَّر" رکھا ہے۔ اور وہ مصابیح کی بہترین شرح ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے "کتاب المَسَالِكِ فِي عِلْمِ المَنَاسِكِ" کے نام سے چالیس ابواب میں ایک کتاب لکھی تھی۔ آپ کی وفات ۶۱۶ھ کو ہوئی۔ آپ کی تاریخ وفات ''محدثِ زیبا'' کے لفظ سے نکلتی ہے۔

مؤرخ محمد قزوینی نے "شدُّ الإزار في حطِّ أوزار عن زوّار المَزار" (ص ١٩٠، طبع طهران) پر اپنی تعلیقات میں کہا ہے:

فصیح خوافی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ شیخ تورپشتی شروع شروع میں شیراز میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد ۶۵۵ھ میں ملکہ قتلغ ترکان کے حکم کو مان کر ''کرمان'' میں سکونت پذیر ہوگئے۔ اور یہ ملکہ کرمان کے قراختائیائی بادشاہوں میں سے تھی۔ آپ کی وفات بھی وہیں پر ۶۶۱ھ میں ہوئی۔ (اور صحیح یہ ہے کہ آپ کی وفات ٦٦٦ھ کے بعد ہوئی)۔ فصیح خوافی نے جو کچھ کہا ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کی جائے پیدائش ''تورپشت'' یا اس کی کوئی نواحی بستی رہی ہوگی۔

کئی کبار علماء نے آپ کے پاس پڑھا۔ چنانچہ صاحب "التلویح في شرح المصابیح" صدر الدین ابو المعالی مظفر بن محمد عمری عدوی اور امیر اصیل الدین عبد اللہ بن علی علوی محمدی وغیرہ آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

علامہ تورپشتی اپنے زمانے کے طریقت کے مشائخ میں سے ایک تھے۔ آپ نے تصوف وطریقت کو شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی (ت ۶۳۲ھ) سے حاصل کیا تھا، جو بلند پایہ صاحبِ طریقت تھے۔ آپ نے ان سے خرقۂ خلافت بھی حاصل کیا اور آپ کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ جن لوگوں نے علامہ تورپشتی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا اور ان کے بعد گدی سنبھالی، ان میں آپ کے بیٹے مجد الدین تورپشتی ہیں۔ ان کا سلسلہ.....

......بھی کافی پھیل گیا تھا۔

حافظ شمس الدین سخاوی شافعی نے علی بن مبارک شاہ ساوی کے شاگرد، علامہ محدث شیخ عبدالرحیم بن عبدالکریم بکری صدیقی جرہی شیرازی کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب "الضَّوءُ اللامع" (٤ : ١٨١) میں کہا ہے:

ایسے ہی آپ نے شیخ نورمحمد بن عبداللہ کرمانی سے خرقۂ خلافت پہنا، اور انہوں نے مجد بن شہاب فضل اللہ تورپشتی سے حاصل کیا۔ انہوں نے اپنے والد صاحب سے اور انہوں نے سہروردی سے حاصل کیا۔

میرا خیال ہے کہ فضل اللہ تورپشتی ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے "مَصَابِيحُ السُّنَّة" کی شرح کی۔ آپ نے اس کی تکمیل ۶۶۲ ھ میں کی۔ (اس کے بعد وہ کب تک جیئے، اس بارے میں اب تک کوئی خبر نہیں مل سکی۔ گمان کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی وفات اس کے بعد ہوگئی ہوگی)۔ اور آپ نے اس شرح کا نام "المیَسَّر" رکھا۔ یہ نام یقیناً اسم بامسمّٰی ہے، اس لیے کہ جو شخص حدیث کے معانی، اس کی فقہی بصیرت اور اس کے معارف و مغز کو پانا چاہے، یہ شرح اس کے اس مقصد کو واقعۃً آسان کردیتی ہے۔

جس نے اس شرح کا مطالعہ کیا ہوگا، اسے اس بات کا یقین حاصل ہوگیا ہوگا کہ فضل اللہ تورپشتی تحقیق اور دقتِ نظر کے ساتھ ساتھ کمالِ قدرت اور باریک بینی میں علمِ راسخ کے مالک تھے۔ موصوف نے فقہ الحدیث کے استخراج، حدیث کے اسرار، اس کے محامل کے بیان، اور اس کے مقاصد کے ادراک کے ساتھ ساتھ اس کے لغوی معانی کی بدرجۂ کمال مختصر عبارت کے ساتھ تشریح و توضیح میں مقدور بھر صلاحیتیں اس طرح جھونک دی ہیں کہ آپ اپنے پیش رو علماء پر بھی فوقیت لے گئے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آپ نے یہ شرح ایسے مرتب کی ہے کہ اس نے عقلوں کو مدہوش اور لوگوں کو پرکیف اور آسودہ کردیا ہے۔

آپ کے بعد آنے والوں میں بہت کم کوئی آپ کا ہم سر اور برابر کا ہوا ہوگا۔ بلکہ آپ کے بعد آنے والے تو آپ کے نقشِ قدم پر چلے ہیں، اور انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ آپ اس باب میں ان کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ کی قدر و منزلت اور علوِّ شان کی معرفت کے لیے یہ جلیل القدر اور عدیم النظیر کتاب ہی کافی ہے، جو کہ آپ کی زندہ و تابندہ یادگار ہے اور فقہ الحدیث اور اس کے معارف میں آپ کی عظمتِ شان کی یاد تازہ کرتی ہے۔ علامہ محقق مفضال شیخ محمد ادریس کاندھلوی نے اپنی شرح "التعلیق الصبیح" میں آپ کی کتاب کی ایسی تعریف کی ہے کہ جس کے بعد اس پر مزید کسی تقریظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس شرح کے لکھنے میں میرا زیادہ تر اعتماد "مصابیح السُّنَّة" کی اس شرح پر رہا ہے جو شیخ شہاب الدین فضل اللہ بن حسین تورپشتی حنفی رحمہ اللہ نے لکھی ہے۔ بجانِ من! یہ تو بہت ہی لطیف شرح اور پرشکوہ تصنیف ہے، جو حسین فوائد اور ایسے معانی پر مشتمل ہے جو اب تک ایسے خیموں میں بند تھے کہ جنہیں اب تک نہ تو کسی انسان نے چھوا تھا اور نہ ہی کسی جن نے۔

علامہ تورپشتی کی یہ شرح ملا علی قاری رحمہ اللہ کے سامنے نہیں تھی۔ اسی لیے وہ اس کی عبارات کو طیبی کی شرح کے واسطے سے اپنی شرح "مرقاۃ المصابیح" میں نقل کرتے ہیں اور طیبی نے نقل میں ان کی عبارات کا اختصار کیا ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کتاب کی کما حقہ قدر نہیں کی۔ جب کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کتب خانے میں "المیسر" موجود تھی، اور وہ اپنی عربی کتاب: لمعات التنقیح في شرح مشكاة المصابيح اور فارسی کتاب "أشعةُ اللمعات في شرح المشكاة" میں اس کتاب کے حوالے نقل کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ "المنهج القويم ......

......في الصراط المستقيم" جو فارسی میں ہے اس میں بھی اس کی نقول موجود ہیں۔ بہر حال، انہی وجوہ سے ان کی شرح حسنِ اقتباس اور جودتِ اختصار کی وجہ سے ملا علی قاری کی شرح سے ممتاز ہے۔

محقق و محدث شیخ محمد ادریس کاندہلوی اپنی کتاب "التَّعلِیقُ الصَّبِیح" میں ان کی کتاب سے نقول تامہ لیتے ہیں اور یہ اقتباسات علامہ تورپشتی کی غزارتِ علمی، حسنِ اسلوب، دقتِ نظر اور فقہ الحدیث اور اسرار الحدیث پر کلام میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس باب میں ان کی کہی ہوئی باتیں ابحاث کا لبِّ لباب ہیں، اور وہ تحقیق کی انتہا اور اہلِ تحقیق کے ہاں قبولیت کے درجے کو پہنچی ہوئی کتاب ہے۔

اے کاش! اگر شیخ محمد ادریس کاندہلوی "التعليق الصبيح على مشكاة المصابيح" کی بجائے، علامہ تورپشتی کی "المیسّر" کو چھپوا دیتے تو یہ امت کی ایسی امتیازی خدمت ہوتی جو کبھی نہ بھلائی جا سکتی۔ بلادِ عربیہ میں ایک دَارُ النَّشر نے یہ ارادہ کیا تو ہے کہ وہ اس کام کو سرانجام دے گا۔ اگر تمہیں قدر ہو تو یہ بڑی قابلِ قدر کوشش ہے۔

"المُیَسَّر" کا دو جلدوں میں، ایک قدیم خطی نسخہ، حکومتِ آصفیہ، حیدر آباد، دکن، ہند کے کتب خانے میں موجود ہے۔

فضل اللہ تورپشتی نے اپنی شرح "المُیَسَّر" کے شروع میں کہا ہے:

"تمام تعریفیں اسی اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں حق راستہ دکھا کر اس کے دلائل ہم پر واضح کر دیے۔ ہمارے لیے ہدایت کا راستہ کھول دیا، اور اس کے راستوں کو بیان کر دیا۔ اور ہماری طرف اپنے بندے اور رسول، چنے ہوئے فرد اور خلیل کو مبعوث کیا۔ چنانچہ ہم نے اس ہدایت کی نشانیوں کو پہچان لیا، اس کی وحی اور نازل شدہ احکام کو جان لیا۔ تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں جس نے تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن مجید ہم پر نازل کیا، اور علم کے کسی قدر حصے کا واقف کار بنا کر اس کے معانی الہام کیے۔

اور تمام تعریفیں اسی اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کتاب کا نگران بنا کر، اور وجوہِ خطاب اور مورِدِ وحی والہام کا بیان کرنے والا بنا کر بھیجا۔ اور اپنے رسول کو شرائع اور احکام کا مصدر، حلال و حرام کی تفصیل بیان کرنے والا، ہدایت کے راستوں کا بیج، سیدھے راستوں کا حامی، شرک والحاد کا مٹانے والا، اللہ تعالیٰ کا فضل اور عباد و بلاد پر رحمت اترنے کا سبب بنا کر بھیجا"۔

اور کتاب کے آخر میں کہا ہے:

"اس کتاب کے لکھنے سے، صفر ۶۶۲ھ کو، دن کے آخری حصے میں فراغت نصیب ہوئی۔ الحمدُ لله ربُّ العالمين أوّلا وآخرا. والصّلاة والسّلام علىٰ رسولِه محمّدٍ، ظاهراً وباطناً، وعلىٰ أولادِه وأصحابِه - رضوان الله عليهم -".

اس نسخے کے کاتب نے کہا ہے:

"اس کتاب کی کتابت سے چھوٹے فقیر بندے علی بن حسین بن محمد کرمانی - اللہ تعالیٰ اس کے کام سیدھے کرے، اور دارین میں اس کی تمنائیں پوری کرے - کو منگل کے روز، ۲۴ رمضان المبارک ۷۷۳ھ میں، کرمان کے علاقے میں، فراغت ملی"۔

آپ کی تالیفات میں سے "المعتمد" اور "المعتقد" ہندوستان میں چھپ چکی ہیں۔

۱۰۱: آپ شرف الدین حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی ہیں۔ آپ مفسر، محدث، متقن، ضابط، ادیب، نحوی، لغوی، وسیع المعرفت، کثیر العلم، صاحبِ فضل، خوب سیرت، اپنے ملکیت کے سخی، اور طلبہ و غرباء کا اکرام کرنے والے تھے۔ آپ قراءات، حدیث اور ادب کی خوب .....

...... معرفت رکھتے تھے۔ آپ کے تمام اوقات میں تدریس، افادے اور تالیف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

آپ کو فقہ الحدیث اور اس کے خزانوں اور مخفی باتوں کے اظہار میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان معاملات میں کوئی بھی آپ کا ثانی نہ تھا۔ اور اس سب کے ساتھ آپ کو زبان دانی کے علم میں سے بھی وسیع حصہ ملا تھا۔ آپ شذوذ اختیار کرنے والوں کے لیے ننگی تلوار تھے اور سنت کا دفاع ایسے کرتے کہ مخالف کا ابطال کر کے چھوڑتے۔ صلاح وتقویٰ اور عفت سے متصف ہونے کے باوصف بحث میں منصف اور عادل تھے۔

آپ کے شاگرد ولی الدین خطیب نے "الإکمال في أسماء الرّجال" میں آپ کے بارے میں کہا ہے:

''آپ مفسرین کے سلطان، محققین کے امام، ملت ودین کے لیے باعثِ شرف وافتخار، مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت، حسین بن عبداللہ بن محمد طیبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی درازیٔ عمر سے سب کو متمتع ہونے کی توفیق عطا فرمائے''۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (ت۸۵۲ھ) اپنی کتاب "الدُّرر الکامنة" میں رقم طراز ہیں:

''آپ میراث میں ملنے والے مال اور تجارت کے اشتغال کی وجہ سے صاحب ثروت آدمی تھے۔ ہمیشہ مقاماتِ خیر میں خرچ کرتے رہنے کی وجہ سے آخری عمر میں فقیر ہو گئے تھے۔

آپ ذی عزت، متواضع، عقیدے کے اچھے، فلاسفہ اور مبتدعہ پر شدت سے ردّ کرنے والے تھے۔ اور باوجود یکہ ان دنوں مسلمانوں کے کئی علاقوں پر ایسے ہی لوگوں کا قبضہ تھا، پھر بھی آپ ان کے فضائح وقبائح کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے بے حد محبت کرنے والے، انتہائی شرمیلے، آخری عمر میں ضعفِ بصر کے باوجود، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے پابند رہے۔ بغیر کسی طمع کے علومِ اسلامیہ کے طلبہ کی معاونت میں مصروف رہتے۔ بلکہ آپ انہیں حدیث پڑھاتے، ان کی مدد کرتے، اور اپنے علاقے کے علاوہ دوسرے علاقوں کے جاننے اور نہ جاننے والے لوگوں سے بھی کتابیں عاریۃً لے کر، پڑھنے کے لیے طلبہ کو دے دیتے۔ اور اس کے پیچھے صرف ان لوگوں کی محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا تھا جو شریعت کی تعظیم کرتے ہیں اور دینی علوم کے پھیلانے میں مشغول ہیں۔

آپ قرآن وسنت سے دقائق کے استخراج میں انتہائی مشہور تھے۔ کشاف کی ایک مبسوط شرح لکھی، جس میں اہل سنت کے مذہب کے مخالفین کو خوب خوب جواب دیے ہیں۔ جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا، وہ آپ کے فضل وعلم کا معترف ہو جائے گا۔ آپ نے اپنے کسی شاگرد کو تاکید کی تھی کہ وہ "المصابیح" کا اختصار آپ کے منہاج پر کر دے، اور اس کا نام "مشکاۃ" رکھا تھا۔ آپ نے اس کی بڑی بہترین شرح کی۔ پھر تفسیر کے موضوع پر ایک کتاب جمع کرنا شروع کی، اور امام بخاری کی صحیح کی قراءت کے لیے ایک مجلس کا نظم بنایا۔ چنانچہ آپ صبح سے ظہر تک تو تفسیر میں مشغول رہتے، اور ظہر سے عصر تک بخاری شریف کے سماع کی مجلس قائم رہتی۔ آپ کا یہ معمول وفات کے دن تک چلتا رہا، چنانچہ آپ تفسیر کی مشغولیت سے فارغ ہو کر فریضۂ ظہر کی اقامت کے لیے کھڑے ہو ہی رہے تھے کہ قبلہ رُو ہونے کی حالت میں آپ کا وقتِ رحلت آ گیا۔ یہ ۲۳ شعبان ۷۴۳ھ، اور منگل کا دن تھا''۔

حافظ سیوطی (ت۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب "بغیة الوُعاة في طبقات اللّغویّین والنُّحاة" میں کہا ہے:

''آپ حسین بن محمد بن عبداللہ طیبی (طاء کے کسرے کے ساتھ) ہیں۔ آپ مشہور امام، علومِ عقلیہ، عربیت، معانی اور بیان میں علامہ تھے۔

میں کہتا ہوں: آپ نے اپنی کشاف کی شرح میں ذکر کیا ہے کہ: آپ نے ابو حفص سہروردی سے علم حاصل کیا تھا۔ ......

جب میں نے ... فلاں اور فلاں ... نسخہ حاصل کر لیا، تو میرا ارادہ یہ بنا کہ میں اس متن کو ایک ایسی لطیف شرح اور نہج کے ساتھ ضبط کروں جو الفاظ کے ساتھ اس کے معانی کو بھی ضبط کرے۔ اس کی روایات کے ساتھ اس کے معانی کی بھی تحقیق کرے۔ اس لیے کہ آج کل کے لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں، اور علوم کی تحصیل، خصوصاً اس فن حدیث شریف میں لوگوں کی مشقت اٹھانے کی عادت اور مجاہدہ بہت کمزور پڑ گیا ہے اور ایسا ہونا یقیناً اس وقت کا تقاضا ہے جو کہ زمانہء نبوت سے ایک ہزار سال سے تجاوز کر چکا ہے۔

مصطفیٰ بن عبد اللہ (ت ۱۰۶۷ ھ) جو حاجی خلیفہ کے نام سے مشہور ہیں، اپنی کتاب "کَشْفُ الظُّنُوْن" میں اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شیخ نور الدین علی بن سلطان محمد ہروی، معروف بہ قاری (ت ۱۰۱۴ھ) نے "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيْح" پر "مِرْقَاةُ الْمَفَاتِيْح" نامی ایک عظیم ممزوج شرح، چار جلدوں میں لکھی ہے، جس میں تمام شروح وحواشی کو جمع کر دیا ہے"۔

...... آپ ہی کے بارے میں محدث محمد بن عبد الباقی زرقانی نے اپنی "الْمَوَاهِبُ اللَّدُنِّيَّة" کی شرح میں کہا ہے:

علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبد اللہ طیبی۔ طیبی: طاء کے کسرے کے ساتھ ہے، اور بلدِ واسط اور اہواز کے علاقے کے درمیان واقع "طیب" کی جانب منسوب ہے۔

سیوطی کا کہنا ہے کہ: آپ کو علم حدیث میں خاص مہارت تھی، لیکن آپ حفاظ کے درجہ تک نہیں پہنچ پائے۔ اور کتب ستہ، مسند احمد اور سنن دارمی جیسی کتب ہی آپ کی منتہائے نظر تھیں۔ تخریج کرتے وقت ان کتب سے باہر نہیں جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صاحبِ کشاف کوئی معروف حدیث ذکر کرتے ہیں، مگر علامہ طیبی اس کی ٹھیک سے تخریج نہیں کر پاتے، اور ان کتب میں موجود اس کی ہم معنیٰ حدیث کو ذکر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تخریج کی کوتاہی ہے۔

شیخ عبد الوہاب شعرانی (ت ۹۷۳ھ) نے اپنے استاذ شیخ الاسلام زکریا انصاری (ت ۹۲۶ھ) سے اپنی کتاب "لواقح الأنوار القدسية في بيان عهود المحمدية" (ص ۶۳۲ طبع مصر ۱۳۸۱ھج) میں نقل کیا ہے:

میں نے اپنے استاذ شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمہ اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

کسی بھی زمانے میں یہ بات بہت کم پائی جاتی ہے کہ: کسی شخص میں فقہ وحدیث اور تصوف جمع ہو جائیں۔ کہتے ہیں: ہمیں "الکشاف" کا حاشیہ لکھنے والے علامہ طیبی کے بعد سے اب تک کسی اور کے بارے میں یہ بات نہیں پہنچی کہ اس میں یہ سب باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اور جس شخص میں یہ تین علوم جمع ہو جائیں، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے اس کے زمانے میں "شيخ أهل السنة والجماعة" کا لقب دیا جائے۔ اور ایسے شخص کو جو کوئی یہ لقب نہ دے، تو اس نے یقیناً ظلم کیا۔

علامہ شعرانی اپنی کتاب "لطائف المنن والأخلاق في بيان وجوب التحدُّث بنعمة الله على الإطلاق" (ص ۴۰، طبع مصر) میں رقم طراز ہیں:

"علامہ طیبی محدث، صوفی، نحوی، فقیہ اور اصولی تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک عالم میں یہ سب صفات جمع ہو جائیں"۔

علامہ طیبی کے بعد یہ تمام صفات ملا علی قاری، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ میں بھی جمع تھیں، اسی لیے ہم نے انہیں ان کے زمرے میں ذکر کیا ہے۔

اور اس شرح کو اللہ تعالی نے شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ اور اسی لیے یہ شرح علماء و طلباء کے ہاں متداول ہے۔ اور بہت کم ایسا دیکھنے میں آئے گا کہ کوئی محدث ہو اور وہ اس کتاب سے رجوع اور استفادہ نہ کرتا ہو۔

اس شرح کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ: انہوں نے مذہب حنفی کا دفاع کیا ہے، اور حدیث وسنت سے اس کا اثبات کیا ہے۔ شیخ ولی الدین خطیب عمری تبریزی، جو "مِشْكَاةُ الْمَصَابِيح" کے مؤلف ہیں، وہ شافعی المذہب تھے، لہٰذا ہر باب میں انہوں نے وہی احادیث وآثار نقل کیے ہیں جن سے شافعیہ استدلال کرتے ہیں۔ اور ان نصوص سے اعراض کیا ہے جو حنفیہ کا مستدل ہیں۔ اور مستزاد یہ کہ ان کی یہ کتاب رواج بھی پا گئی اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس کی شرح بھی کی، جن میں سے اکثر شافعیہ تھے۔ ان شراح میں سے پہلے شارح تو صاحب "مشکاۃ" کے شیخ علامہ طیبی ہیں، اور آخری حافظ ابن حجر ہیتمی مکی ہیں، جو ملا علی قاری کے شیخ تھے۔ چنانچہ شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی شروح میں اپنے مذہب کی خدمت کی، اور حنفیہ کے دلائل کو جیسے ذکر کیا جانا چاہیئے تھا، اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

ملا علی قاری نے جب یہ صورت حال دیکھی تو انہوں نے مذہب حنفیہ کے دلائل کی توضیح اور علی وجہ الاتم اور بطریق احسن انہیں بیان کرنے پر کمر ہمت باندھی، چنانچہ کہتے ہیں:

"اس کتاب کی شرح لکھنے کا باعث یہ بات بھی تھی کہ اکثر شراحِ "مِشْكَاة" شافعی المذہب تھے جس کی وجہ سے انہوں نے کتاب کے متعلقہ مسائل کو اپنے مذہب کی نہج پر ذکر کیا۔ اور اپنے مشرب کے مقتضی کی وجہ سے ظواہر احادیث سے استدلال کیا اور اصحاب حنفیہ کو اصحاب رائے کا لقب (۱۰۲) اس گمان پر دے دیا کہ وہ حدیث پر عمل نہیں کرتے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہیں روایت اور حدیث بیان کرنے کا نہ پہلے کچھ پتہ تھا، نہ اب تک کچھ درک ہے۔

---

۱۰۲ : تعجب کی بات ہے کہ شافعی علماء، حنفی علماء کو رائے کا طعنہ دیتے ہیں، حالانکہ حنفیہ تو شافعیہ کی بہ نسبت رائے سے زیادہ دور ہیں۔ خاص اس موضوع پر مشہور گہرے اصولی قاضی محب اللہ عثمانی صدیقی حنفی بہاری نے ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جس کی مؤرخ کبیر سید عبد الحی بن فخر الدین حسنی نے اپنی کتاب "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" (٦ : ٢٥١) میں ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے تلخیص کر دی ہے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

موصوف کا ایک رسالہ اس بات کے اثبات میں ہے کہ: حنفیہ کا مذہب، شافعیہ کے مذہب کی بہ نسبت رائے سے زیادہ دور ہے۔ جبکہ اس کے خلاف کی شہرت ہو گئی ہے۔ موصوف نے اس پر کئی وجوہ سے استدلال بھی کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ان وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ کتاب وسنت کا عموم قطعی ہے، لہٰذا قیاس کے ذریعہ اس کے خلاف کرنا صحیح نہیں، بخلاف شافعیہ کے کہ وہ حنفیہ کے اس اصول کے برخلاف قیاس کو جائز جانتے ہیں۔ حنفیہ عام کو رائے سے خاص نہیں کرتے، بلکہ اس مقام پر محض رائے سے خاص کرنے کو باطل قرار دیتے ہیں۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: شافعیہ قیاس سے مطلق کو مقید پر محمول کر لیتے ہیں، جب کہ حنفیہ قیاس سے مطلق کو مقید پر محمول نہیں کرتے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: مرسل احادیث حنفیہ کے ہاں مقبول ہیں۔ چنانچہ وہ مراسیل کو رائے پر ترجیح دیتے ہیں، بخلاف .....

......شافعیہ کے، کہ وہ رائے کو مراسیل پر مقدم کرنے کے قائل ہیں، الا یہ کہ مرسل کو کوئی دوسری مسند یا مرسل روایت تقویت دیتی ہو، یا وہ مرسل بھی قولِ صحابی ہو، یا اکثر علماء بھی اس کے قائل ہوں، یا تا یقینی ہو کہ راوی ثقہ سے ہی ارسال کرتا ہے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: اگر صحابی کا قول غیر مدرک بالرائے ہو، تو تمام حنفیہ کے ہاں وہ حجت اور سنت کے ساتھ ملحق ہوگا اور قیاس پر مقدم ہوگا، جب کہ امام شافعی صحابی کے ایسے قول کو رائے پر مقدم اور حجت نہیں سمجھتے، بلکہ وہ اپنی رائے کو صحابی کے قول پر مقدم سمجھتے ہیں۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: ایسی عبارت جو مطلق ہو، اس میں کسی شرط یا کسی جزء کی زیادتی کے بارے میں امام شافعی کہتے ہیں کہ: رائے سے بھی جائز ہے، کیونکہ وہ بس تخصیص اور تقیید ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرح کرنا گویا کتاب کے اطلاق کو منسوخ کرنا ہے۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: حنفیہ نے رائے کی صحت کے اثبات میں انتہائی احتیاط برتی ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ: علت (یعنی اصل اور فرع کے درمیان پایا جانے والے وصفِ جامع) کا مؤثر ہونا ضروری ہے۔ یعنی نص یا اجماع سے اس کی تاثیر ظاہر ہوئی ہو۔ جب کہ شافعیہ نے صرف احالہ اور مناسبتِ علیہ پر ہی اکتفا کرلیا ہے، اگرچہ اس کی تاثیر شرعاً ظاہر نہ ہوئی ہو۔ بلکہ شافعیہ نے تو اسے تب بھی صحیح قرار دیا ہے جب کہ وصف اور حکم میں مناسبت تک ظاہر نہ ہوئی ہو۔

انہی وجوہ میں سے یہ بھی ہے کہ: شافعیہ حدود وکفارات کو رائے سے ثابت کر دیتے ہیں، جب کہ حنفیہ حدود کو رائے سے قطعاً ثابت نہیں کرتے، اس لیے کہ حدود ایسی تحدیدات پر مشتمل ہیں جو عقل کے دائرۂ کار میں نہیں آتیں۔

فقیہ ومسندِ ہند شیخ علامہ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ فاروقی حنفی دہلوی (ت ۱۲۳۹ھ) نے دو رسالے لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ائمہ اربعہ کے مذاہب کے مآخذ کے بیان میں ہے، جب کہ دوسرا رسالہ مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصولوں کے بارے میں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں مکمل رسالوں کو یہاں نقل کر دیں۔ پہلا رسالہ یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّي عَلیٰ نَبِیِّہِ الکَرِیمِ، وَعَلیٰ آلِہٖ وَصَحْبِہٖ ذَوِي الفَضْلِ الجَسِیْمِ.

اللہ تم پر رحم کرے، خوب جان لو کہ: احکامِ شرعیہ کے دلائل اور مآخذ سے بحث کرنے والے مجتہدین نے جب دیکھا کہ: رسول اللہ ﷺ کی بعض احادیث متعارض ہیں، اور صحابہ وتابعین کے بعض آثار بھی باہم مختلف ہیں۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ احکام میں یہی مآخذ سب سے عام اور زیادہ ہیں، تو وہ متحیر ہوئے، اور اس تعارض واختلاف کی تحقیق وچھان بین میں انکی مختلف آراء سامنے آئیں اس تعارض سے بچنے کی کیا صورت ہے۔

چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ نے تو اسے اختیار کیا کہ: اہلِ مدینہ کے عمل کو حکم قرار دینا چاہیے۔ اس لیے کہ مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کا گھر، آپ کے خلفاء کا وطن اور صحابہ واہلِ بیت کا مسکن ہونے کے ساتھ ساتھ مہبطِ وحی بھی رہا ہے، اور وہاں کے لوگ وحی کے معانی کی سب سے زیادہ معرفت رکھتے ہیں، چنانچہ ہر وہ حدیث جو اہلِ مدینہ کے عمل کے خلاف ہوگی، اس کے بارے میں ضروری ہے کہ یا تو وہ منسوخ ہو، یا مؤوّل ہو، یا مخصوص ہو، یا محذوف القصہ ہو۔ لہٰذا، کوئی بھی مذکورہ بالا قسم کی حدیث قابلِ اعتناء نہیں ہوگی، اور اس پر احکامِ شرعیہ کا مدار نہیں ہوسکتا......

...... امام شافعی نے اسے اختیار کیا کہ: ایسی صورتِ حال میں اہلِ حجاز کو فیصل قرار دیتے ہوئے، درایت کو بھی کام میں لانا چاہیے۔ چنانچہ آپ بعض روایات کو ایک حالت پر، اور بعض دوسری روایات کو کسی دوسری حالت پر محمول کرتے ہیں، اور جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب آپ مصر اور عراق تشریف لے گئے، اور ان بلاد کے ثقہ رواۃ سے بہت سی روایات سنیں تو ان کے نزدیک ان روایات میں سے بعض اہلِ حجاز کے عمل پر قابلِ ترجیح قرار پائیں۔ اسی وجہ سے ان کے مذہب میں قدیم اور جدید، دو قسم کے اقوال پیدا ہو گئے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ہر حدیث کو اس کے ظاہر پر ہی رہنے دیا جائے، لیکن انہوں نے اتحادِ علت کے باوجود کئی ایک موارد کے ساتھ تخصیص کی ہے۔ چنانچہ ان کا مذہب علیٰ خلاف القیاس، اور فارق نہ ہونے کے باوجود اختلافِ حکم پر مشتمل ہو کر سامنے آیا۔ اسی وجہ سے ان کے مذہب کو ظاہریہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے متبعین کا مختار طریقہ بہت ہی واضح ہے۔ جس کا کسی قدر تفصیلی بیان یہ ہے کہ جب ہم تتبع کرتے ہیں تو ہمیں شریعت میں دو قسم کے احکام ملتے ہیں۔

ایک قسم تو ایسے قواعد کلیہ کی ہے جو مطرد و منعکس یعنی جامع و مانع ہے۔ جیسے ہمارا یہ کہنا: "لا تزرُ وازرةٌ وزرَ أُخریٰ"، کہ کوئی شخص کسی بھی دوسرے شخص کے گناہ میں ماخوذ نہ ہوگا، یا ہمارا یہ کہنا کہ: "الغُنْمُ بِالغُرْمِ"، کہ غنم بسبب غرم ہے۔ یا یہ کہنا: "الخراج بالضّمان"، کہ خراج تو ضمان کے سبب ہے۔ یا ہمارا یہ قول: "العتاق لا یحتمل الفسخ" کہ آزاد کرنا فسخ نہیں ہو سکتا، اور یہ کہنا: "البیعُ یتمُّ بالإیجاب والقبول"، کہ بیع ایجاب وقبول سے کامل ہوتی ہے۔ اور یہ کہنا: "البیِّنةُ علیٰ المُدَّعِي والیمینُ علیٰ مَن أنکر"، کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہے، اور قسم منکر پر ہوتی ہے۔ اور اس جیسے لاتعداد اقوال مزید بھی ہیں۔

دوسری قسم ان قواعد کی ہے، جو جزئی حوادث اور مخصوص اسباب کے پس منظر میں وارد ہوئے ہیں۔ گویا کہ یہ قواعد ان کلی قواعد سے بمنزلہ استثناء کے ہیں۔ چنانچہ مجتہد پر واجب ہے کہ ان کلیات کی محافظت کرے اور ان کے ماسوا جو بھی ہے، اسے چھوڑ دے، اس لیے کہ درحقیقت شرائع انہیں کلی قواعد سے عبارت ہیں۔

اور جہاں تک ان کلیات کی مخالفت کرنے والے ایسے احکام کا تعلق ہے کہ جن کے یقینی اسباب اور مخصصات کا ہمیں پتہ نہیں ہے، تو ان کی طرف کوئی التفات نہیں کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر: یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ: فاسد شروط کی بنا پر بیع باطل ہو جاتی ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قصے میں جو یہ وارد ہوا ہے کہ انہوں نے اونٹ کی بیع میں مدینہ منورہ تک سواری کرنے کی شرط لگائی تھی، تو یہ ایک شخصی اور جزئی قصہ ہے۔ لہٰذا، یہ قصہ مذکورہ بالا کلی قواعد کا معارضہ کرنے کی اہلیت وقوت نہیں رکھتا۔ ایسے ہی ''حدیثِ مصرّاۃ'' شریعت سے ثابت شدہ اس قطعی قاعدہ کلیہ کے معارض ہے، جو یہ ہے کہ: "الغنم بالغُرم"۔ اس جیسے دوسرے بھی کئی مسائل ہیں۔

ان کلی قواعد کی رعایت کرنے سے، بہت ساری ایسی احادیث جو اسی پس منظر میں وارد ہوئی ہیں، کا ترک کرنا لازم آتا ہے۔ لیکن حنفیہ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور اجتہاد کرتے ہوئے ان کلی قواعد کی محافظت کے ساتھ، جزئیات کو ان کلیات کے تحت درج کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ مجمل سا کلام ہے، جس کی تفصیل بہت طویل ہے، جس کی اس وقت گنجائش نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دینے والے ہیں۔

دیکھیے: الفتاویٰ العزیزیّة في المسائل المشکلة: ص ۷٦، طبع دهلي......

......دوسرا رسالہ جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے اصول کے بارے میں وہ درج ذیل ہے: (استادِ محترم ڈاکٹر محمد عبد الحلیم نعمانی صاحب دامت برکاتہم نے یہاں فتاویٰ عزیزی کی جس عبارت کا عربی ترجمہ کیا ہے، ہم اس کا اردو ترجمہ خود کرنے کی بجائے، فتاویٰ عزیزی (اردو) سے اس کا ترجمہ نقل کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ابتداء میں وہ سوال بھی نقل کر رہے ہیں جس کے جواب میں شاہ صاحب نے یہ تحریر لکھی تھی، اور اسے استادِ محترم نے نقل نہیں کیا)۔

سوال: حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کے وہ مسائل جن سے ہر اعتراض رڈ ہوتا ہے، بیان فرمائیے؟

جواب: علماء متاخرین نے بغرض محفوظ رہنے مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے، چند قواعد جمع کئے ہیں، اس غرض سے کہ ان قواعد سے وہ لوگ رڈ کرتے تھے جملہ ان اعتراضات کو جو اس بنا پر ہوتے تھے کہ مثلاً فلاں مسئلہ اس مذہب کا حدیث صحیح کے خلاف ہے۔

قاعدۂ اوّل: خاص کے بارے میں حکم ہے کہ وہ صاف طور پر بیان کیا ہوا ہے تو اس کے ظاہر معنی کے سوا دوسرے کوئی معنی نہیں کہا جا سکتا۔ علماءِ متاخرین نے اس قاعدہ سے اِن امور کو رڈ کیا ہے: فرضیت سورۂ فاتحہ کی نماز میں، اور فرضیت تعدیلِ ارکان وغیرہ کی۔ اور علماءِ کرام کا بیان ہے کہ لفظ: "اُسْجُدُوْا" اور "اِقْرَؤُوْا" کا خاص ہے۔ اس کے معنیٰ صاف طور پر بیان کئے ہوئے ہیں، تو اگر اس کے معنیٰ میں کچھ اور بڑھا کر بیان کیا جائے تو یہ لازم آئے گا کہ اس کے ظاہر اصل معنیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا معنیٰ بیان کیا گیا۔

قاعدہ دوسرا: زیادت، کتاب پر بمنزلہ نسخ کے ہے۔ تو یہ زیادت نہ ہوگی مگر آیتِ صریح یا حدیثِ مشہور سے۔

قاعدہ تیسرا: حدیث مرسل: مانند حدیثِ مسند کے ہے۔

قاعدہ چوتھا: ترجیح نہ ہوگی کسی حدیث کو بسبب کثرت راویوں کے، بلکہ ترجیح بسبب فقہِ راوی کے ہوگی۔

قاعدہ پانچواں: جرح قابل قبول نہیں، مگر جب اس کی تفسیر کی جائے۔ اور یہ قاعدہ اس سبب سے ثابت ہے کہ جرح اور تعدیل اکثر اجمالی ہے۔

قاعدہ چھٹا: ابن ہمام نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے، جس روایت کو صحیح کہا، امام بخاری اور مسلم نے اور ان لوگوں نے جو، اُن کے مانند ہوئے، تو ہم لوگوں پر واجب نہیں کہ ہم لوگ اس کو قبول کریں اور کس طرح ہم لوگ اس کو قبول کر سکتے ہیں۔ اس واسطے کہ اکثر راویوں میں لوگوں نے اپنے اجتہاد کی بناء پر اختلاف کیا ہے۔ کسی راوی کے بارے میں بعض نے جرح کی ہے اور بعض نے تعدیل کی ہے، تو ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے مجروح کیا ہو، وہ ہمارے امام کے نزدیک عادل ہو۔ اور ایسا ہی یہ بھی ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے ضعیف کہا ہو، یا اس کے بارے میں وضعِ حدیث کی تہمت لگائی ہو، وہ راوی ہمارے امام کے نزدیک مستوجب اس طعن کا نہ ہو، تو ہم لوگوں پر واجب نہیں کہ ان لوگوں کا قول قبول کریں۔ اور کس طرح ہم لوگ قبول کر سکتے ہیں، اس واسطے کہ ممکن ہے کہ جس راوی کو لوگوں نے مجروح کیا ہو، وہ عادل ہو، قابلِ اعتبار ہو۔ تو اب ہم لوگ اسی قول پر اعتماد کریں گے، جو ہمارے مذہب کے اصحاب نے ذکر کیا ہے۔

قاعدہ ساتواں: کہا بعض صاحبِ فتاویٰ نے کہ: جب کسی مسئلہ میں قول امامِ اعظم اور صاحبین کا ہو، اور اس مسئلہ میں کوئی حدیث بھی ہو، اور اس حدیث کے بارے میں حکم صحت کا دیا گیا ہو، تو واجب ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے قول کی اتباع کی جائے، نہ حدیث کی۔ اس واسطے کہ ہم جانتے ہیں شان میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین کے یہ کہ: باوجود صحیح ہونے احادیث کے، آپ صاحبوں نے یہ دریافت......

......فرمایا ہے کہ کس حدیث میں معارضہ ہے، اور کس حدیث سے استنباط صحیح ہے۔ یعنی یہ سب تحقیق کر کے ان حضرات نے کسی مسئلہ میں حکم فرمایا ہے کہ ان ائمہ کا قول حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ اور ان ائمہ کرام کی شان میں ہمارا گمان نہیں کہ ان ائمہ کو حدیث نہ پہنچی ہو۔ اس واسطے کہ ان ائمہ کا زمانہ قریب ہوا ہے، زمانہ سے آنحضرت ﷺ کے، اور ان ائمہ کا علم وسیع تھا۔

قاعدہ آٹھواں: جس روایت کو راوی غیر فقیہ نے روایت کیا ہو، اور وہ ایسی روایت نہیں کہ اس میں رائے کو دخل ہو سکے تو اس کو قبول کرنا واجب نہیں۔

قاعدہ نواں: عام قطعی ہے مانند خاص کے، تو تخصیص نہیں ہو سکتی عام میں خاص کے ذریعے سے۔ مگر اس وقت میں ایسی تخصیص ہو سکتی ہے کہ وہ خاص قطعی ہو۔ تو یہ تخصیص بمنزلہ نسخ کے ہوگی۔ البتہ جب عام مخصوص منہ البعض ہو تو تخصیص میں یہ شرط نہیں کہ خاص قطعی ہو۔ روایت ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "من ماتَ وهو يعلمُ أن لا إلهَ إلاَّ اللّٰهُ، دَخَلَ الجنَّةَ".

ترجمہ: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جو شخص فوت ہوا، اور وہ یہ جانتا ہے کہ نہیں ہے۔ کوئی معبود قابلِ پرستش سوا اللہ کے تو وہ بہشت میں داخل ہو گا۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ایمان سے مراد صرف تصدیق ہے، اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الوُضُوءُ مِن كلِّ دمٍ سائِلٍ". (رواه الدارقطني) یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: وضو لازم ہوتا ہے خون بہنے والے سے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو دار قطنی نے۔

اور استدلال کیا حنفیہ نے اس حدیث سے اس مسئلہ میں کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس نجاست کے نکلنے سے بھی جو غیر سبیلین سے خارج ہو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إذا أتيتُم الغائِطَ فلاَ تَستَقبِلُوْا القِبلَةَ، ولا تَستَدبِرُوْهَا، ولكِنْ شَرِّقُوْا أو غَرِّبُوا". (متفق عليه). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جب جاؤ پائے خانہ کے لیے، تو قبلہ کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھو، بلکہ پورب رُخ یا پچھم رُخ بیٹھا کرو۔ روایت کیا اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ حدیث مدینہ منورہ میں فرمائی، اور وہاں پورب رُخ اور پچھم رُخ بیٹھنے میں قبلہ کی طرف نہ رُخ ہوتا ہے اور نہ پیٹھ ہوتی ہے۔ اس واسطے وہاں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: پورب یا پچھم رُخ بیٹھا کرو۔ تو ہر جگہ قبلہ کا لحاظ چاہیے کہ پاخانہ بیٹھنے میں منہ یا پیٹھ قبلہ کی طرف نہ ہو۔ یہ حدیث بھی موافق مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُقَبِّلُ بَعْضَ أزْوَاجِهِ، ثُمَّ يُصَلِّي وَلَا يَتَوَضَّأُ". (رواه الترمذي). یعنی آنحضرت ﷺ بوسہ لیتے تھے بعض ازواج کا، پھر نماز پڑھتے تھے اور وضو نہ کرتے تھے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو ترمذی نے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بابت فرمایا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَن مَسِّ الرَّجُلِ ذَكَرَهُ، بعدَ ما يتوَضَّأُ. قالَ: وَهَلْ هُوَ إلاَّ بَضْعَةٌ مِنْكَ". (رواه النسائيُّ والتِّرمذيُّ وأبو داود). یعنی پوچھا گیا آنحضرت ﷺ سے مسئلہ اس بارے میں کہ کوئی شخص بحالتِ وضو اپنا ذَکَر چھوئے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ:......

......وہ کیا ہے، سوا اس کے کہ ایک پارہ گوشت ہے تمہارا۔

روایت کیا ہے اس حدیث کو نسائی اور ترمذی اور ابوداود نے۔ یہ حدیث دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی، اس مسئلہ میں کہ مس ذکر ناقضِ وضو نہیں۔ یعنی ذکر کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "أَسْفِرُوْا بِالفَجْرِ؛ فَإِنَّهُ أَعْظَمُ لِلأَجْرِ". (رواه الترمذيُّ).

یعنی روشنی میں پڑھو فجر کی نماز، اس واسطے کہ اس میں زیادہ ثواب ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث شریف سے تائید ہوتی ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "الإمامُ ضامِنٌ. المُؤذِّنُ مُؤتَمِنٌ. اَللّٰهُمَّ أَرْشِدِ الأئمَّةَ، وَ اغْفِرْ لِلْمُؤذِّنِينَ". (رواه أبو داود وأحمد والتِّرمذيُّ). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: امام ضامن ہے اور مؤذن امانت دار ہے۔ اے پروردگار! رہنمائی فرما ائمہ کی اور مغفرت فرما مؤذنین کی۔ روایت کیا اس حدیث کو احمد اور ابوداود اور ترمذی نے۔

ظاہر ہے کہ اس حدیث سے تائید ہوتی ہے مذہبِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اس مسئلہ میں کہ: نماز مقتدی کی موقوف ہے امام کی نماز پر۔

إنَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ صلَّى المَغرِبَ بِسُورَةِ الأعراف، فِي رَكعَتَيْنِ". (رواه النَّسائيُّ). یعنی پیغمبر ﷺ نے نماز پڑھی مغرب کی، اور دونوں رکعات میں سورۂ اَعراف پڑھی۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو نسائی نے۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ وقت مغرب کا بہت تنگ نہیں، اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "إنَّما جُعِلَ الإمامُ لِيُؤتَمَّ بِه، فإذا كبَّر فَكبِّرُوا، وإذا قرَأ فَأَنْصِتُوْا. (رواه أبو داود والنَّسائي). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: امام اس غرض کے لیے ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے۔ تو وہ جب "اللہ اکبر" کہے، تو تم لوگ بھی "اللہ اکبر" کہو۔ اور جب وہ قرآن شریف پڑھے تو تم لوگ چپ رہو۔ روایت کیا اس حدیث کو ابوداود اور نسائی نے۔

اس حدیث سے تائید ہوتی ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی، یعنی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنا چاہیے۔

نَهىٰ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أن يَعْتَمِدَ الرَّجُلُ عَلىٰ يَدَيْهِ إذَا نَهَضَ فِي الصَّلاةِ". (رواه أبو داود). یعنی: منع کیا رسول اللہ ﷺ نے کہ مرد زمین پر ٹیک لگا کر نماز میں اٹھے، یعنی کھڑا ہو۔ روایت کیا اس حدیث کو ابوداود نے۔

یہ حدیث دلیل ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَ مِنكُمْ مُصَلِّياً بعدَ الجُمُعَةِ، فَلْيُصَلِّ أرْبَعاً". (رواه مسلم). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جو شخص تم لوگوں سے نماز پڑھتا ہو، بعد جمعہ کے، تو چاہیے کہ وہ نماز پڑھے چار رکعت۔ روایت کیا اس کو مسلم نے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت بعد فرض جمعہ کے چار رکعت ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَن نامَ عَنْ وِتْرِه، فَلْيُصَلِّ إذَا أَصبَحَ". (رواه التِّرمذيُّ).

یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جو شخص سو جائے نماز وتر میں، تو چاہیے کہ صبح کو پڑھے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کو ترمذی نے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس سے ثابت کیا ہے کہ نماز وتر کی واجب ہے۔ .....

......قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "إِذَا أَحْدَثَ أَحَدُكُم، وقَد جَلَسَ فِي آخِرِ صَلاتِهِ، قبلَ أن يُسَلِّمَ، فَقَد جَازَتْ صَلَاتُه". (رواہُ التِّرمذيُّ) یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جب بے وضو ہو کوئی تم لوگوں میں سے، اخیر قعدے میں، قبل سلام پھیرنے کے، تو اس کی نماز ہو جائے گی۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی نے۔

یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اس واسطے کہ لفظ سلام کا کہنا آخر نماز میں امام اعظم کے نزدیک فرض نہیں۔

عَن عَلقَمَةَ قَالَ: قَالَ لَنا ابنُ مَسعُودٍ: أَلَا أُصَلِّي بِكُمْ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ، فَصَلّٰى وَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا مَرَّةً وَاحِدَةً، مَعَ تَكْبِيْرِ الإفتِتَاحِ". (رواہُ التِّرمَذيُّ والنَّسائيُّ). یعنی روایت ہے علقمہ سے کہ کہا علقمہ نے ہم لوگوں سے کہ: کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہ: کیا نماز پڑھوں ساتھ تم لوگوں کے، کہ مثل نماز پیغمبر خدا ﷺ کے، پھر نماز پڑھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے، اور نہ اٹھائے اپنے دونوں ہاتھ، مگر ایک مرتبہ ساتھ تکبیر افتتاح کے۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی اور نسائی نے۔

اس حدیث سے تائید ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی اس امر میں کہ تکبیر افتتاح کے سوا اور کسی تکبیر میں رفع یدین نہیں۔

إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ وأبا بَكرٍ وعُمَرَ - رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمَا - كَانُوْا يَفْتَتِحُوْنَ الصَّلَاةَ بِ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ". (رواہ مسلم). یعنی: پیغمبر خدا ﷺ سے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما شروع کرتے تھے نماز، ساتھ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" کے۔ روایت کیا اس حدیث کو مسلم نے۔

اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید ہوتی ہے، اس مسئلہ میں کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ سے نہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "مَنْ صَلّٰى صَلَاةً لَم يَقرَأْ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ، فَهِيَ خِدَاجٌ"، ثلاثًا، "غَيْرُ تَامٍّ". (رواہُ التِّرمَذِيُّ). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ جس نے ایسی نماز پڑھی کہ اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص ہوگی۔ یہ تین مرتبہ فرمایا، یعنی وہ نماز ناتمام ہوگی۔ روایت کیا اس حدیث کو ترمذی نے۔

اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو اس نماز کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے لفظ "خداج" کا فرمایا۔ اور خداج ناقص کو کہتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ پڑھنا سورۂ فاتحہ کا نماز میں واجب ہے، فرض نہیں۔ اس واسطے کہ فرض چھوڑ دینے سے نماز میں صرف نقصان نہیں ہوتا، بلکہ وہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔

عَن أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ: "مَنْ أَدْرَكَ الرَّكْعَةَ أَدْرَكَ السَّجْدَةَ، وَمَنْ فَاتَتْهُ أُمُّ الْقُرْآنِ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ". (رواہ مَالِكٌ). یعنی: روایت ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ: جس نے پایا رکوع کو، پس پائی اس نے وہ رکعت، اور جس سے فوت ہوئی سورۃ فاتحہ تو اس سے فوت ہوگئی بہت نیکی۔ روایت کیا اس حدیث کو امام مالکؒ نے۔

یہ بھی دلیل ہے اس مسئلہ کے لئے کہ سورۃ فاتحہ نماز میں فرض نہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مذہب ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَصَاعِدًا. (رواہ مسلم) یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہ ہوگی نماز اس کی جس نے سورۂ فاتحہ اور اس سے زیادہ نہ پڑھا۔ روایت کیا اس حدیث کو مسلم نے۔

اس حدیث سے بھی ظاہر تائید ہوتی ہے مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی۔ اس واسطے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لا صلاۃ، تو اگر اس......

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کا موقف یہ ہے: ضعیف حدیث کو اس مجرد قیاس پر، جو محتمل خطا بھی ہوسکتا ہے، مقدم کیا جائے گا۔ ہاں ان کی ثاقب رائے، جو ان کے بڑے مناقب میں سے شمار کی جانی چاہیئے، یہ ہے کہ وہ نصوص کے ظواہر پر ہی جمے نہیں رہتے، بلکہ وہ چھپی ہوئی باتوں کی تحقیق میں غور وفکر کرتے ہیں، اور مسائل کے چہروں سے پردوں کے نقاب کو نوچ ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: تمام مخلوق فقہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی محتاج ہے۔ ان کا یہ قول ان کے علوم کی گہرائی اور کمال انصاف پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالی ان دونوں ائمہ سے راضی ہو اور ہمیں ان کے علوم سے نفع پہنچائے۔

بہر حال! میں نے چاہا کہ میں ان کے دلائل کا ذکر کروں، ان کے مسائل کی وضاحت کروں، اور ان کے جواب میں، مخالفت کرنے والوں کے مقابل ہو کر دفاع کروں، تا کہ عوام جو فقہی مسائل کے دلائل کی کامل معرفت نہیں رکھتے، اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حنفیہ کے مسائل، حنفیہ کے دلائل کے خلاف ہیں۔ اور میں نے اس کا نام "مِرقَاةُ المَفَاتِيحِ لِمِشْكَاةِ المَصَابِيحِ" رکھا ہے۔

اور جب ملا علی قاری یہ محسوس کرتے ہیں کہ: علامہ طیبی اور ابن حجر ہیتمی ہمارے مذہب پر اعتراض کر رہے ہیں تو اس کا تعقب کرتے ہیں، اور اپنے علوم کے ذریعے اپنے موقف کو بڑی فصاحت سے بیان کرتے ہیں۔ (۱۰۳)

...... سے یہ مراد لی جائے کہ اصل نماز نہ ہوگی، تو لفظ: "فصاعداً" کا درست نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ بالا جماع اس کا کوئی قائل نہیں کہ سورۃ فاتحہ سے زیادہ پڑھنا واجب ہے، تو معلوم ہوا کہ اس حدیث میں مراد نفی نماز سے: نفی کمال ہے۔

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ أَفْطَرَ فِي تَطَوُّعِهِ فَلْيَقْضِهِ". (رواه أحمد). یعنی: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ: جس نے افطار کیا روزہ نفل میں، تو اس پر لازم ہے کہ اس کا قضا روزہ رکھے۔ روایت کیا اس کو احمد نے۔ یہ دلیل ہے مذہبِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی، اس مسئلہ میں کہ نفل لازم ہو جاتی ہے شروع کر لینے سے۔

(نوٹ: مذکورہ بالا اردو ترجمہ لفظی ترجمے کا رنگ لیے ہوئے ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مترجم نے اردو فتاوی عزیزی کی عبارت کو من وعن نقل کر دیا ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں کی)۔

۱۰۳: اس کا نمونہ علامہ طیبی کا وہ قول ہے جو انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد "لا يمنعنّ رجلٌ أهلَه أن يأتوا المساجدَ" کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے نے کہا تھا کہ: ہم تو انہیں منع کریں گے، تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تم آگے سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ کہتے ہیں: اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے موت تک اس بیٹے سے بات نہیں کی۔

مجھے اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو سنی کہتا ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کی سنت کی کوئی بات سنتا ہے، اور اس کی اپنی بھی کوئی رائے ہوتی ہے، اور وہ اپنی رائے کو سنت پر ترجیح دیتا ہے۔ بھلا اس کے اور بدعتی کے درمیان فرق ہی کیا ہے؟ کیا ایسے شخص نے یہ نہیں سنا کہ: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کی خواہشات تک میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہو جائیں۔ اور یہ دیکھو، عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں، جو اکابر صحابہ اور فقہاء میں سے ہیں۔ کیسے اللہ اور اس کے رسول کی وجہ سے غضب ناک ہوئے، اور اہلِ خرد......

انہی جلیل القدر اہداف کی وجہ سے موصوف کی یہ شرح ان نافع کتب میں شمار کی جاتی ہے جن کا دقتِ نظر اور گہرائی سے مطالعہ کرنا ہر محدث کے لیے ضروری ہو گیا ہے۔

...... کی عبرت کے لیے اس ایک بات پر ساری عمر کے لیے اپنے جگر کے ٹکڑے کو چھوڑ دیا۔

ملا علی قاری نے اس پر تعقب کرتے ہوئے کہا ہے:

طیبی کے کلام سے علماءِ حنفیہ کے بارے میں معترضانہ کنایہ کی بو آتی ہے، جس کی بنیاد ان کا یہ گمان ہے کہ حنفیہ رائے کو حدیث پر مقدم کرنے کی وجہ سے اصحاب رائے کے نام سے موسوم ہیں۔ حالانکہ موصوف کو یہ معلوم نہیں کہ: انہیں ان کی رائے میں باریک بینی اور حذاقتِ عقل کی وجہ سے ''اصحاب رائے'' کا نام دیا گیا ہے۔ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تمام لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے محتاج ہیں''۔

اور ابن حزم نے کہا ہے: تمام حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ: ان کے امام کا مذہب یہ ہے کہ: حدیث اگرچہ ضعیف ہی ہو، رائے اور قیاس سے اولیٰ ہے۔ اس بات کا تذکرہ سخاوی نے کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے "المناقب الحسان" میں کہا ہے:

خوب جان لو کہ: بعض علماء نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو ''اصحاب رائے'' ہونا نقل کیا ہے، کہیں ایسا نہ سمجھ لینا کہ اس سے اُن کا مقصد اِن حضرات کی تنقیص کرنا ہے۔ ان کا مقصد نہ تو تنقیص ہے اور نہ ان کی طرف کوئی ایسی نسبت کرنا ہے کہ وہ اپنی رائے کو رسول اللہ ﷺ کی سنت، اور آپ کے اصحاب کے اقوال پر مقدم کرتے ہیں۔ اور ائمہٴ حنفیہ اس الزام سے بالکل بری ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے یہ بات طرقِ کثیر سے منقول ہے کہ: وہ سب سے پہلے قرآن مجید سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر مسئلہ قرآن میں نہ ہو تو سنت کو لیتے ہیں۔ اور اگر وہاں بھی نہ ملے تو پھر صحابہ کے قول کو لے لیتے ہیں۔ اور اگر صحابہ کی آراء کسی مسئلہ میں مختلف ہوں تو وہ رائے لے لیتے ہیں جو ان کے اقوال میں قرآن وسنت کے زیادہ قریب نظر آئے۔ اور اگر صحابہ میں سے کسی کا بھی قول نہ ملے تو پھر کسی تابعی کا قول نہیں لیتے، بلکہ ان کی طرح خود ہی اجتہاد کرتے ہیں۔

ابن مبارک کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ سے منقول حدیث آ جائے، تو سر آنکھوں پر۔ اگر صحابہ کے اقوال آ جائیں، تو ہم ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر تابعین کی بات آ جائے تو ہم خود ہی اس کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔

آپ ہی کا قول ہے کہ: لوگوں کی باتوں پر تعجب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: رائے سے فتویٰ دیا، حالانکہ کسی اثر کی بنیاد پر فتویٰ دیا ہوتا ہے۔ مزید کہتے ہیں: کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ: کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پیش کرے۔ اور نہ ہی صحابہ کے متفق علیہ اجماعی مسائل کے ہوتے ہوئے رائے پیش کی جا سکتی ہے۔ ہاں، اگر کسی مسئلے میں صحابہ کی آراء مختلف ہو جائیں، تو ہم اجتہاد کرتے ہوئے، ان آراء میں سے کسی ایسے قول کو اختیار کر لیتے ہیں جو کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہو۔ اور جب معاملہ اس سے بھی آگے چلا جائے تو جو شخص اختلاف کی معرفت رکھتا ہے، اس کو چاہیے کہ رائے سے اجتہاد کرے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قیاسات کی باریک بینی کی وجہ سے امام مزنی آپ کے کلام کو بہت کثرت سے دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کے بھانجے امام طحاوی کو آپ کے اسی عمل نے اس پر ابھارا کہ وہ امام شافعی کے مذہب سے، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف منتقل ہو گئے تھے، جیسا کہ امام طحاوی نے خود بھی اس کی صراحت کی ہے۔ ملا علی قاری کا کلام مکمل ہو گیا۔

محدث شیخ عبدالباری بن عبدالوہاب انصاری لکھنوی اپنی بے مثل کتاب: "التَّعلِيقُ المُختَار عَلىٰ كِتَابِ الآثَار" کے مقدمے میں رقم طراز ہیں:

یہ وہ کتب ہیں جن کا مطالع اور درس وتدریس ہر حنفی محدث کے لیے انتہائی ضروری ہے:

۱ : "موطأ الإمام مالك، رواية الإمام محمَّد بن الحسن الشَّيباني" رَحِمَهُ الله: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اللہ کی کتاب کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب یہی ہے۔ اور نمونہ کے اعتبار سے ہمیں یہ کافی ہے۔

۲ : "مسند الإمام أبي حنيفة، رواية الإمام محمَّد بن الحسن الشَّيباني: جو کتاب الآ ثار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب میں امام محمد نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی احادیث کو جمع کیا ہے، جن میں سے اکثر "عن حمَّاد عن إبراهيم عن أصحاب عبد الله بن مسعود عن ابن مسعود، وغيره من الصَّحابة رَضِي اللهُ عنهم، جیسی اصح الاسانید والی روایات ہیں۔ اور یہ ایسی روایات ہیں جن کا درجہ تحقیق کے وقت صحاح ستہ کی روایات سے کسی طرح بھی فروتر نہیں ہے۔

۳ : كتاب الحجج للإمام محمد بن الحسن الشَّيبانيّ رحمه الله: اس کتاب میں امام محمد نے اہل مدینہ اور امام مالک کے اساتذہ کے مقابلے میں اہل عراق اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اساتذہ کے درمیان تقابل اور محاکمہ کیا ہے۔

۴ : جامع المسانيد: اس کتاب کو امام، محدث، فقیہ، قاضی القضاۃ ابومؤید محمد بن محمود بن محمد خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع کیا ہے۔

۵ : معاني الآثار: للإمام ہمام حافظ، نقادِ اعلام، شیخ الحدیث ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ابن عبدالملک بن سلمۃ بن سلیمان بن خباب ازدی حجری مصری طحاوی۔

۶ : مُشكِلُ الآثَار للإمَام الطَّحاوي : اور یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں ہے۔

میں (یعنی عبدالحلیم نعمانی) کہتا ہوں کہ: اس کتاب کے چار اجزاء طبع ہو چکے ہیں، جو مکمل کتاب کا نصف حصہ بنتا ہے۔ ہاں مشکل الآ ثار کا اختصار طبع ہوا تھا، لہٰذا جسے مشكل الآثار نہ مل سکے، اس کے لیے یہ اختصار بھی غنیمت ہے۔

اس کے بعد انتہائی ضروری ہے کہ صحیحین، جامع ترمذی، سنن اربعہ (یعنی سنن ابن ماجہ، سنن نسائی، سنن دارمی، سنن ابو داؤد سجستانی)، سنن ابوداؤد طیالسی اور سنن دارقطنی کا سرسری مطالعہ کیا جائے۔ اور اگر مل سکے تو مصنف ابن ابی شیبہ، مسند عبدالرزاق، طبرانی کی کتب اور جامع الاصول کا مطالعہ کیا جائے۔ اور اگر کنز العمال مل جائے تو اس کا مطالعہ اکثر ابواب میں ان تمام کتب سے مستغنی کر دے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فتح المنَّان، عقود الجواهر المنيفة، مسند الإمام برواية سندي، بخاری شریف پر علامہ عینی کی شرح، اور مشکاۃ شریف پر ملا علی قاری اور محدث دہلوی کی شروحات بہت نافع ہیں (۱۰۴)۔

ملا علی قاری مذکورہ بالا اہداف ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اپنی اس شرح میں دینی واجتماعی معاملات کے ساتھ ساتھ مکہ مکرمہ میں عام روزمرہ کی زندگی کے تغیرات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

---

۱۰۴ : دیکھیے: محمد عبدالباری انصاری، مقدمۃ التعلیق المختار علیٰ کتاب الآ ثار ص ۱۰۰۔

ہمارے زمانے میں چوتھی اذان بھی شروع ہوگئی ہے، اس اذان کا مقصد مسجد میں خطیب کے داخل ہونے کی اطلاع دینا ہے۔(۱۰۵)

نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث: مَهلاً، فوَالَّذِي نَفسِي بِيَدِه! لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً، لَو تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ، کی شرح میں فرماتے ہیں:

تعجب بالائے تعجب ہے ہمارے زمانے کے ان علماء اور ہمارے وقت کے ان مشائخ پر، کہ وہ لوگوں سے یہ حقیر مال لیتے ہیں، اور پھر اسے مناصب کی تحصیل میں خرچ کرتے ہیں، اور انجام کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے۔ ہم اللہ تعالیٰ ہی سے عافیت اور رزق حلال اور اچھے اعمال کی توفیق کا سوال کرتے ہیں(۱۰۶)۔

مزید اس حدیث: أمّا إبل الشّياطين : فقد رأيتُها، يخرج أحدكم بنجيبات معه، قد أسمنها، فلا يعلو بعيرا منها، ويمُرُّ بأخيه قد انقطع به، فلا يحمِلُه" کی شرح میں فرماتے ہیں:

ہمارے زمانے میں تو اس سے بھی بڑی بات ظہور پذیر ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل کے اکابر کے ساتھ بہت سے اونٹ ہوتے ہیں، اور کمزور لوگوں کے (لاغر) اونٹوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اونٹ حج کے راستے میں کرایہ پر لیے گئے ہوتے ہیں، اور وہ ان کے سامان کو (استہزاءً) نیچے گرادیتے ہیں، اور کبھی (جبرا) لے ہی لیتے ہیں۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ(۱۰۷)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ملا علی قاری نے اپنی اس کتاب میں اختلافی مسائل میں انتہائی وضاحت دبیان کا طریقہ اپنایا ہے، اور ایسی مباحث میں مکمل انصاف سے بحث کی ہے، تا کہ بقدرِ امکان حدیث کے معانی سمجھنے میں آسانی ہو اور بہت خوبصورتی سے ایسی ابحاث کو مکمل کیا ہے۔ اور احسان وافادہ کے ساتھ تحقیق واستدلال میں انتہائی اچھی بحث وتنقید کی ہے۔ علامہ محقق محدث بارع شیخ محمد ادریس کاندھلوی نے، اپنی کتاب "التعليق الصّبيح علىٰ مشكاة المصابيح" میں موصوف کی شرح کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

ملا علی قاری کی یہ لطیف شرح ہے جس کی نہج ضبط الفاظ کے ساتھ مبانی کے مکمل ضبط، اور روایات کی معانی کے ساتھ مکمل تحقیق ہے۔ موصوف نے اس میں تمام شروح وحواشی کو جمع کر کے ان کا استقصاء کیا ہے، اور کوئی چھوٹی اور بڑی بات ایسی نہیں ہے جس کو انہوں نے سمیٹ نہ لیا ہو۔ اور میں کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اس تعلیق سے بہت استفادہ کیا ہے۔

اور میرے نزدیک شرح حدیث میں یہ سب سے زیادہ نافع اور جامع کتاب ہے۔ اور یہ ایسی ضخیم کتاب ہے کہ "مشكاة المصابيح" کی مطبوعہ شروحات میں سے کوئی بھی بحث واستدلال اور تحقیق وتنقیح میں اس پائے کی نہیں ہے۔ موصوف نے اس میں متفرقات کو جمع اور محفوظ کیا ہے، اور مباحث کو مکمل طور پر گرفت میں لے لیا ہے۔

---

۱۰۵ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۲: ۲۵۲)۔

۱۰۶ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۴: ۱۷)۔

۱۰۷ : دیکھیے: مرقاۃ المفاتیح (۴: ۲۱۹)۔

اکیلی یہی کتاب فہم حدیث میں تمہیں اچھا ملکہ حاصل کرا دینے کی کفیل ہے، بشرطیکہ تم اس سے خصوصی اور کثیر تعلق رکھو۔ کوئی بھی محدث اور فقیہ اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا، اسی وجہ سے عالم اسلام میں اس سے انتفاع عام اور شائع وذائع ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علم، اور تصنیف وحسن تالیف سے حظ وافر پایا تھا۔ ان کی تصنیفات مشرق ومغرب میں مشہور ہوگئی ہیں۔ اور دنیا میں شاید ہی کوئی عربی یا عجمی کتب خانہ ایسا ہو جس میں ملا علی قاری کی کئی ایک کتابیں موجود نہ ہوں، بخلاف ان کے اقران ومعاصرین کی کتب کے، کہ وہ سفید اونٹنی (کی نایاب نسل) سے بھی زیادہ کم یاب ہیں۔ علامہ محبی فرماتے ہیں:

"ملا علی قاری کا تذکرہ مشہور، اور ان کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے جلیل القدر فوائد پر مشتمل بہت زیادہ کتب تالیف کی ہیں"۔

متاخرین کے ہاں ملا علی قاری کی تصانیف کی روایت کا چلن بھی رہا ہے، چنانچہ بعض محدثین نے ان سے ان کی تالیفات کی روایت کی اجازت لی۔ اور وہ علماء جنہیں موصوف نے اپنی کتب کی روایت کی اجازت دی، بہت زیادہ ہیں، اور انہوں نے ان کی کتب کی روایت کے سلاسل کو اپنی معاجم اور اثبات میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت، محدث الہند علامہ شیخ قطب الدین ولی اللہ بن عبد الرحیم عمری دہلوی (ت ۱۱۷۶ھ) اپنی کتاب الاِنتِبَاه فِي سَلَاسِلِ أَولِيَاء اللهِ وأَسَانِيدِ وَارِثِي رَسُولِ الله میں رقم طراز ہیں:

ان میں سے ملا علی قاری ہیں۔ ان کے قلم سے مشکاۃ کی شرح اور بہت سے دوسری مشہور کتب ہیں جو میں نے شیخ اسعد عتاقی مکی کے ہاں دیکھی تھیں جن کی روایت وہ "عَن أبيه عَن جدّه" کے طریق سے کرتے ہیں اور ان کے جدّ اَمجد کو شیخ علی قاری نے اپنی تمام کتب کی روایت کی اجازت کی وصیت کی تھی۔ چنانچہ ان کے پاس موصوف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسوّدات موجود تھے (۱۰۸)۔

علامہ محدث فقیہ شیخ محمد امین بن عمر حسینی جنہیں عموماً ابن عابدین کے نام سے پکارا جاتا ہے، نے اپنے مشہور ثبت: "عُقُودُ اللّآلِي فِي الأَسَانِيدِ العَوَالِي" میں ملا علی قاری کی تصانیف کا تذکرہ کرتے ہوئے ان تک اپنی سند بایں الفاظ بیان کی ہے: ملا ابراہیم کورانی، عن ملا محمد شریف بن ملا یوسف کورانی صدیقی، عن سید معظم حسینی بلخی، عن مؤلفہا ملا علی بن سلطان محمد قاری (۱۰۹)۔

اس مقام پر ہم سمجھتے ہیں کہ موصوف کی علمی میراث کی طرف اشارہ کر دینا چاہیئے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ کی مطبوع کتب کے نام درج ذیل ہیں:

الأحاديث القدسية

الثماء الحنية في أسماء الحنفية

---

۱۰۸ : دیکھیے: شاہ ولی اللہ کی فارسی کتاب: الانتباه في سلاسل أولياء الله وأسانيد وارثي رسول الله. اس کتاب کا وہ خطی نسخہ، جو ان کے پوتے شیخ عمر بن محمد اسماعیل بن عبد الغنی دہلوی کے نسخہ سے نقل کیا گیا ہے، میرے بڑے بھائی محدثِ بارع، محقق مفضال، شیخ محمد عبد الرشید نعمانی (اطال اللہ بقاءہ) کے پاس محفوظ ہے۔

۱۰۹ : "عقود اللآلي في الأسانيد العوالي" (ص ۱۴۲، مطبعة المعارف، بولاية سورية ۱۳۰۲هج)

جمع الوسائل فی شرح الشمائل

الحرز الثمین للحصن الحصین

الحزب الأعظم والورد الأفخم لانتسابه واستناده الی الرسول الأکرم

شرح الشفاء (للقاضی عیاض)

الضابطية للشاطبية وهو شرح علی الشاطبية

عین العلم وزین الحلم

فتح الرحمان بفضائل شعبان

المبین المعین لفهم الأربعین

مرقاة المفاتیح لمشکاة المصابیح

المشرب الوردی فی حقیقة (مذهب) المهدی

مصطلحات أهل الأثر علی نخبة الفکر

منح الروض الأزهر فی شرح الفقه الأکبر

المنح الفکرية بشرح المقدمة الجزرية

الموضوعات

نزهة الخاطر الفاتر فی ترجمة سیدی الشریف عبد القادر

اور موصوف کی وہ کتب جو اب تک طبع نہیں ہو سکیں، درج ذیل ہیں:

اتحاف الناس بفضل وج وابن عباس

الأجوبة المحررة فی البیضة الخبیثة المنکرة

الأدب فی فضائل رجب. چار مقالے ہیں.

الأزهار المنثورة فی الأحادیث المشهورة

الاستئناس بفضائل ابن عباس

الاستدعاء فی الاستسقاء

الأسرار المرفوعة فی الأخبار الموضوعة

الاصطناع فی الاضطباع

الأصول المهمة فی حصول المتمة

إعراب القاری علی أول باب البخاری

الإعلام لفضائل بیت الله الحرام

الاعتناء بالفناء فی الغناء

الانباء بان العصا من سنن الأنبیاء

أنوار الحجج فی أسرار الحج

أنوار القرآن وأسرار الفرقان

الاهتداء فی الاقتداء

بدایة السالك فی نهایة المسالك فی شرح المناسك

البرة فی حب الهرة

البرهان الجلی علی من تسمی من غیر مسمی بالولی

بهجة الإنسان ومهجة الحیوان

بیان فعل الخیر إذا دخل مكة من حج عن الغیرد

البینات فی بیان تباین بعض الآیات

التائبیة فی شرح التائیة لابن المقری

التبیان فی بیان ما فی لیلة النصف من شعبان ولیلة القدر من رمضان

تبعید العلماء عن تقریب الأمراء

التجرید فی إعراب كلمة التوحید

تحفة الحبیب فی موعظة الخطیب

تحقیق الاحتساب فی تدقیق الانتساب

تزیین العبارة فی تحسین الإشارة

تسلیة الأعمی عن بلیة العمی

تشییع فقهاء الحنفیة فی تشنیع سفهاء الشافعیة

التصریح فی شرح التسریح

تطهیر الطویة فی تحسین النیة

تعلیقات القاری علی ثلاثیات البخاری

توضيح المباني وتنقيح المعاني، وهو شرح مختصر المنار لزين الحلبي.

التهدين ذيل التزيين على وجه التبيين. هي رسالة في الإشارة بالمسبحة في التشهد كالمتقدمة

الجمالين على تفسير الجلالين

جمع الأربعين في فضل القرآن المبين

حاشية على فتح القدير

حاشية على المواهب اللدنية

حاشية على شرح رسالة الوضع للسمرقندي

حدود الأحكام

الحظ الأوفر في الحج الأكبر

دامغة المبتدعين وناصرة المهتدين

الدرة المضية في الزيادة المصطفوية

دفع الجناح وخفض الجناح في فضائل النكاح

الذخيرة الكثيرة في رجاء المغفرة للكبيرة

ذيل الرسالة الوجودية في نيل مسألة الشهودية

ذيل الشمائل للترمذي

رد الفصوص

رسالة في الأبوين الشريفين

رسالة في إفراد الصلاة عن السلام

الرسالة العطائية في الفرق بين صفد وأصفد

رسالة في بيان التمتع في أشهر الحج

رسالة في كرامات الأولياء

رسالة في الرد على من نسبه إلى تنقيص الإمام الشافعي

رسالة في مناقشة البيضاوي في الحديث الذي ذكره في رفع العذاب عن أهل القبور

الرهص والوقص لمستحل الرقص

زبدة الشمائل وعمدة الوسائل

الزبدة في شرح قصيدة البردة

سلاسة الرسالة في ذم الروافض من أهل الضلالة

شرح الجامع الصغير للسيوطي

شرح حزب البحر

شرح رسالة بدر الرشيد في ألفاظ الكفر

شرح الرسالة القشيرية

شرح صحيح مسلم

شرح مسند الإمام الأعظم

شرح الوقاية في مسائل الهداية

شفاء السالك في إرسال مالك

شم العوارض في ذم الروافض

الصلاة والجوائز في صلاة الجنائز

صنعة الله في صبغة الله

الضيعة الشريفة في تحقيق البقعة المنفية

الطواف بالبيت ولو بعد الهدم

العفاف عن وضع اليد في الطواف، أي: في وضع اليد على الصدر

العلامات البينات في فضائل بعض الآيات

عمدة الشمائل

غاية التحقيق في نهاية التدقيق. یہ رسالہ ان مسائل کے بارے میں لکھا گیا تھا جن میں اہل حرمین اس وجہ سے مبتلا ہوئے تھے کہ انہیں مخالف مذہب کے امام کی اقتدا میں نماز ادا کرنی پڑتی تھی۔ اور اس وجہ سے ایک ہی مسجد میں تکرار جماعت کی صورت پیش آتی تھی۔ اور ایسے ہی عصر کی نماز کا وقت، قراءت خلف الامام اور جمعہ کی نماز کے بعد کی چار رکعتوں جیسے مسائل اس رسالہ میں زیر بحث ہیں۔

فتح أبواب الدين في شرح آداب المريدين

فتح الأسماع في شرح السماع

فتح باب الاستسعاد في شرح قصيدة بانت سعاد

فتح باب العناية شرح كتاب النقاية

فتح المغطا شرح الموطأ للإمام(۱۱۰)

فرائد القلائد على أحاديث شرح العقائد

فر العون ممن يدعي إيمان فرعون

الفصل المعول في الصف الأول

الفصول المهمة في حصول المتمة

رسالة في إتمام الركوع

فيض الفائض في شرح الروض الرائض في الفرائض

القول الحائز في صلاة الجنائز

قوام الصوام للقيام بالصيام

القول الحقيق في موقف الصديق

القول السديد في خلف الوعيد

كشف الخدر عن حال الخضر

كنز الأخبار في الأدعية وما جاء من الآثار

لب لباب المناسك في نهاية المسالك

لسان الاهتداء في بيان الاقتداء

المختصر الأوفى في شرح الأسماء الحسنى

المرتبة الشهودية في منزلة الوجودية

المسلك الأول فيما تضمنه الكشف للسيوطي

المسلك المتقسط في المنسك المتوسط

المسألة في شرح البسملة

معرفة النساك في معرفة المسواك

المقالة العذبة في العمامة والعذبة

۱۱۰ : شیخ محمد عبدالحیٔ لکھنوی نے "التعلیق الممجّد" میں کہا ہے:
موطأ محمد پر آپ کی شرح دو جلدوں میں ہے، جو لطیف نفائس وغرائب پر مشتمل ہے۔ بس یہ ہے کہ اس میں رجال کی تنقید کے بارے میں کافی تسامحات ہیں، جیسا کہ مختلف مواضع میں آپ ان پر مطلع ہو جائیں گے۔

المقدمة السالمة في خوف الخاتمة

ملخص البيان في ليلة النصف من شعبان

الملمع في شرح لغت المرضع

المعدن العدني في فضل أويس القرني

المنح على حزب الفتح لأبي الحسن البكري

الناموس في تلخيص القاموس

النسبة المرتبة في المعرفة والمحبة (المسألة المشكلة في المعرفة والمحبة والخلة).

النعت المرصع في المجنس المسجع في مشكلاة الصلاة.

المورد الروي في المولد النبوي

الوقوف بالتحقيق على موقف الصديق في ان وقوف الصديق وعمر رضي الله عنهما ما كان إلا في عرفة.

الهيئة السنيات في تبيين أحاديث الموضوعات

الهبة السنية العلية على أبيات الشاطبية الرائية

شیخ محمد طاہر بن عبدالقادر کردی مکی اپنی کتاب "تَارِیخُ الخَطِّ العَرَبِیِّ وآدَابِہ" (ص ۲۹۳) میں کہتے ہیں: آستانہ کے کتب خانہ علی پاشا میں ملا علی قاری کی تمام تصنیفات موجود ہیں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ کی وفات مکہ مکرمہ میں شوال ۱۰۱۴ھ میں ہوئی، اور جنت المعلاۃ میں تدفین عمل میں آئی۔

مشہور مؤرخ مولی محمد محبی (متوفی ۱۱۱۱ھ) اپنی کتاب "خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر" میں فرماتے ہیں: جب ان کی وفات کی خبر مصر کو علماء کو پہنچی، تو انہوں نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، اور مجمع تقریباً چار ہزار سے بھی زیادہ افراد کا تھا۔

شیخ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے "اَلسِّعَایَة" کے مقدمے میں کہا ہے: میں نے جنت المعلی میں موصوف کی قبر کی زیارت کی ہے۔

والحمدُ لِلّٰہ عَلٰی ذٰلِكَ.

محمد عبد الحليم بن محمد عبد الرحيم چشتي

١٧ . ٧ . ١٣٨٦هـ